اُردو نثر کی داستان

قسط ۱۵

ہر ماہ کی یکم تاریخ کو

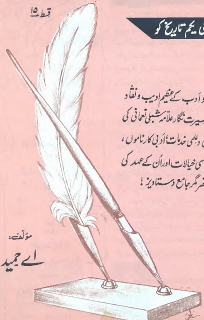

اُردو اَدب کے عظیم ادیب و نقاد
اور سیرت نگار علامہ شبلی نعمانی کی
دینی و علمی خدمات، اَدبی کارناموں،
سیاسی خیالات اور اُن کے عہد کی
مختصر مگر جامع دستاویز!

مؤلف:
اے حمید

۱۵
روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی، اَدبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور

اُردو نثر کا ایک مستند تاریخی و ادبی سلسلہ

اُردو نثر کی داستان

مؤلف:

اے حمید

۱۵

روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

دُنیا کی ہر قومی اور علاقائی
زبان کی روشن کتابوں کا انتخاب

نگران : شیخ نیاز احمد
مُدیرِ مسئول : ارشد نیاز
مُدیر : رب نواز ملک

مجلسِ مشاورت :
اے حمید - ایم - ایس ناز
محمد حنیف شاہد - اشتیاق احمد

آرٹسٹ : سلیم اختر

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پبلشرز، لاہور

ادارہ :
مطبوعات شیخ غلام علی
اَدبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور

فون نمبر :
۵۲۹۰۸ ۶۱۸۵۹ ۲۱۳۰۲۰

تار :
کتاب مین (KITABMAN) لاہور

علامہ شبلی نعمانی اور اُن کی خدمات

یہ "اُردو نثر کی داستان" ۱۵ ہے۔ اُردو ادب کے عظیم ادیب، نقّاد اور سیرت نگار علامہ شبلی کی دینی اور اَدبی خدمات پر محیط ہے۔ مؤلف جناب اے حمید علامہ شبلی کے حالاتِ زندگی پر سیر حاصل روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کے کارہائے نمایاں اور سیاسی خیالات تک کو احاطۂ تحریر میں لے آئے ہیں جس کے لیے وہ لائقِ تحسین ہیں۔ اِس طرح یہ کتاب علامہ شبلی کے عہد کی ایک مختصر مگر جامع دستاویز بن گئی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے حدیث، اصولِ فقہ، ادب اور منطق وغیرہ جیسے علوم کی تحصیل کے لیے دُور دراز کے شہروں کی خاک چھانی، اس دَور کے اساتذہ کی شاگردی اختیار کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے مولوی فاروق چریاکوٹی اور مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ پھر لاہور میں مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے عربی زبان میں دسترس حاصل کی۔ انھی فیض الحسن صاحب سے آپ کو شعر گوئی کا ذوق نصیب ہُوا کیونکہ یہ خود بڑے پائے کے شاعر تھے۔ زیرِ نظر کتاب میں مولوی فیض الحسن صاحب کی تحریر کا نمونہ بھی شامل ہے۔

اور یہ مولوی فیض الحسن صاحب کی صحبت کا ہی اثر تھا کہ علامہ شبلی نے صرف اُنیس سال کی عمر میں غزلیں اور قصیدے لکھنا شروع کر دیے۔ ان کی غزلیں اور قصیدے اُس دَور کے اَدبی رسائل کی زینت بنے۔ آپ جدت پسند اور حقیقت پسند نثر نگار کے ساتھ ساتھ شاعر کی حیثیت سے بھی روشناس ہُوئے۔ آپ کا جھکاؤ زیادہ تر مذہب کی طرف رہا، آپ یوں بھی صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔

آپ کو سر سیّد کی صحبت بھی نصیب ہوئی اور آپ نے ان کے قیمتی کتب خانے سے استفادہ کیا۔ غرض..... علامہ شبلی نعمانی کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اے حمید صاحب زیرِ بحث نہ لائے ہوں۔ اس طرح یہ کتاب نہ صرف اہلِ ذوق قارئین بلکہ طلبا کے لیے بھی ایک امتیازی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی پیدائش اور حالات زندگی

علامہ شبلی نعمانی کی پیدائش بندول ضلع اعظم گڑھ میں ۱۸۵۷ء میں ہوئی۔ شبلی نعمانی کے والد گرامی قدر اعظم گڑھ کے مشہور وکیل تھے۔ ان کا گھرانہ عزت و دینداری میں سب گھرانوں سے بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ شبلی نعمانی نے شروع شروع میں مولوی شکراللہ صاحب سے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد غازی پور آگئے اور یہاں مولوی محمد فاروق چریاکوٹی سے باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولوی محمد فاروق چریاکوٹی بڑے پائے کے عالم فاضل اور استاد تھے۔ عربی ادبیات اور فارسی علوم پر انہیں خاصی دسترس تھی۔ شبلی نعمانی بھی بچپن ہی سے بہت ذہین اور ہونہار طالب علم تھے۔ ان کی ذہانت اور ذکاوت دیکھ کر استاد کو بھی شاگرد سے بہت پیار ہو گیا تھا۔ چنانچہ مولوی محمد فاروق بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ میں شیر ہوں اور یہ میرا بچہ ہے۔ "انا اسد وانت شبلی"۔ شبلی بالکسر بچہ شیر کو کہتے ہیں۔ اور شبلی کے معنی ہیں میرا بچہ۔ ویسے شبلی نعمانی کا نام شبلی حضرت شیخ ابوبکر شبلی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ شبلی ان کے آبائی وطن شبلہ سے بھی منسوب ہے۔

مولوی محمد فاروق چریاکوٹی کے بعد شبلی نے اپنی تعلیم کو آگے بڑھایا اور علم کے حصول کی خاطر دور دور تک سفر اختیار کیا۔ چنانچہ وہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں کہ میں ہر فن مثلاً حدیث، اصول، فقہ، ادب، منطق وغیرہ کو حاصل کرنے کے لئے اس فن کے اساتذہ اور علماء کے پاس دور دور کے شہروں میں گیا اور ان کے پاس رہ کر علم حاصل کیا۔ مولوی محمد فاروق چریاکوٹی کے بعد شبلی رام پور گئے جہاں انہوں نے مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں سے علم مکمل کرنے کے بعد لاہور تشریف لے گئے۔ ان دنوں لاہور کے اورینٹل کالج میں مولوی فیض الحسن سہارنپوری کا بڑا شہرہ تھا۔ مولوی صاحب کالج میں عربی کے مدرس تھے۔ عربی شاعری پر بھی ان کی بڑی گہری اور عمیق نظر تھی۔ چنانچہ شبلی ان کے پاس آئے اور زانوئے تلمذ تہہ کر کے ان سے عربی شاعری کی ابتدائی اور کلاسیکی کتابیں پڑھیں۔ شبلی کے شوق علم کا یہ حال تھا کہ مولوی فیض الحسن صاحب گھر سے کالج جاتے تھے اور شبلی حماسہ کی کتاب کھولے ان کے ساتھ ساتھ چلتے تھے اور راستہ میں پڑھتے جاتے تھے۔ شعر کا ذوق زیادہ تر شبلی کو مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے منتقل ہوا۔ کیونکہ فیض الحسن صاحب، خود بڑے اچھے شاعر تھے، عربی، فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ غزلوں کے علاوہ ان کے نعتیہ قصائد اور مثنوی صبح امید بہت مشہور ہے مثنوی "صبح امید" لاہور میں ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ مولوی فیض الحسن کا اس وقت انتقال ہو چکا تھا۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

عشق کیا اک بلا ہے آفت ہے
شور ہنگامہ قیامت ہے
ننگ و ناموس کو سیاہ کرے
زہد و سالوس کو تباہ کرے
یہ کسی کو کہیں جیتے جی نہ لگے!
دوست کیا دشمنوں کو بھی نہ لگے!
مختصر یہ ہے یہ وہ چوکھٹ
گھر کے گھر ہو گئے جہاں چوپٹ
عشق عاشق ہے اپنی چالوں کا
اس کو کیا ڈر پائے مالوں کا
درد بے پردہ ہے دردوں کی
عشق قوت ہے شیر مردوں کی
دیکھ کر عشق کے نئے دھندے
جی چراتے ہیں چین کے بندے
عشق ہے اک بلائے شور انگیز
خانماں سوز و خانہ برہم ریز
اس کا مصداق ہے یہ افسانہ
جس کا سامع ہو سن کے دیوانہ
گرم ہوں شورشوں کے ہنگامے
چاک ہوں جیب کی طرح جامے
کیوں نہ ہو یہ میری زبانی ہے
گو یہ خود ہی غضب کہانی ہے
میں ہوں اک سینہ ریش و خستہ دروں
سر بسر جوش عشق و شور جنوں
دل یہاں درد کا ٹھکانہ ہے
سینہ یہ نشتروں کا خانہ ہے
ہیں یہ سب درد کی کرامتیں!
ورنہ کس کو نصیب یہ باتیں!
کہ یکایک بتان گل رخسار
آگئے سامنے سے مثل بہار
ہو گیا حسن تازہ محو ظہور!
بام و در سے لگا برسنے نور
روشنی سے ہوئی نظر خیرہ
نور سے ہو گیا مکاں تیرہ
یاں تو بیٹھے نظر سے دامن کھول
واں گھونگٹ وہش نہ بول نہ تول
گورے گورے وہ پھول کے چہرے
پھول کانوں کے پھولوں کے سہرے
ایک تو سب کے پھول سے بردوش
اس پہ پھولوں کی مار تا بہ گوش
بسکہ اپنی بہار پاتے تھے
پھولی پھولے نہیں سماتے تھے

الغرض مولوی فیض الحسن سہارنپوری اس وقت کے اجل عالم اور عربی و فارسی ادبیات کے یگانہ روزگار استاد تھے۔ شبلی پر ان کی صحبت نے گہرا اثر کیا۔ ان کی وفات پر شبلی نے فارسی میں ایک پُر درد مرثیہ کہا تھا۔ شبلی نعمانی نے نوخیز عمری ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا ان کی عمر صرف انیس برس تھی کہ حج کی سعادت نصیب ہوئی اور واپسی پر مدینہ منورہ میں حاضری دی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قصیدہ نعتیہ کہا۔ سفر حجاز کے بعد شبلی نے باقاعدہ علم و ادب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ انہوں نے اسی عمر میں غزلیں اور قصیدے لکھنے شروع کئے جو اس زمانے میں لکھنؤ کے رسالوں "اودھ پنچ" اور "پیام یار" وغیرہ میں چھپتے تھے۔ انہوں نے مشاعروں میں شرکت کی اور خود طرحی غزلیں لکھیں اسی زمانے میں شبلی کی غزلوں پر جدت کا رنگ غالب تھا اور وہ حقیقت پسندی کے قائل تھے۔ شبلی عراق اور شام کے سفر پر گئے ان کی ایک کتاب "اسکات المعتدی" کی شہرت وہاں تک پہنچی ہوئی تھی چنانچہ شام کے ایک عالم نے ان کی اس کتاب کی بہت تعریف کی۔ مولانا کی طبیعت پر شروع ہی سے مذہب کا رنگ غالب تھا اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔

شبلی نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا اور مدرسی کو چھوڑ کر وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا لیکن اس پیشہ کا کذب و افتراء انہیں راس نہ آیا اور اسے ترک کر کے عدالت میں امین دیوانی کی ملازمت کر لی۔ اس ملازمت میں انہیں تیز دھوپ میں گاؤں گاؤں گھوم پھر کر دورے کرنے پڑتے تھے۔ بہت جلد اس ملازمت سے بھی طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ چنانچہ نوکری چھوڑ دی اور گھر بیٹھ کر مضمون نویسی اور شعر و شاعری کا کام شروع کر دیا۔ شبلی نعمانی اپنے استاد مولوی فیض الحسن کی سفارش سے علی گڑھ کالج میں پروفیسر ہو گئے ان کا مشاہرہ چالیس روپے ماہوار مقرر ہوا۔ یہاں وہ سرسید سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ اس زمانے کا حال مولوی عبدالحلیم شرر اپنے ایک مضمون میں یوں لکھتے ہیں۔

> "علی گڑھ میں شبلی نعمانی کو سرسید صاحب نے اپنی کوٹھی کے احاطے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی۔ جو سب سے الگ، بالکل باہمہ اور بے ہمہ تھا۔ اور ایک خاموش مقام تھا ان میں جستجو و تحقیق کا سچا مذاق دیکھ کر سید صاحب نے ان سے ربط و ضبط بڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلاناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی۔ سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور مورخانہ تحقیق کے غور و خوض میں رہتے اور تحقیق و تدقیق کے لئے انہیں اکثر حدیث و فقہ تاریخ و سیر کی کتابوں کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کو انہوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع

کیا۔ مولوی شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی و قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعت نظر کے مولانا شبلی قائل ہوتے جاتے تھے اس سے زیادہ سید صاحب ان کی تلاش اور جستجو اور جلب روایات کے معتقد و معترف ہو گئے تھے۔"

شبلی نعمانی نے سرسید کے کتب خانہ سے سیر حاصل اکتساب فیض کیا۔ وہ کئی گھنٹے وہاں بیٹھے کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے۔ اس زمانے میں شبلی نے 'سیرۃ النعمان' اور 'المامون' ایسی کتابیں تصنیف کیں۔ پروفیسر آرنلڈ کو فارسی زبان سکھائی اور اس سے فرانسیسی زبان سیکھی۔ اس زمانے میں شبلی نے قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ اور تقریباً سبھی اسلامی شہروں کی سیاحت کی۔ وہاں کی بڑی بڑی لائبریریاں دیکھیں اور علماء سے ملاقات کی۔ واپسی پر انہوں نے سفر نامہ لکھا۔

اسی زمانے میں سرسید اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے انتقال کے بعد شبلی نعمانی نے علیگڑھ کالج کی نوکری چھوڑ دی اور واپس اعظم گڑھ آ گئے۔ یہ بات ۱۸۹۸ء کی ہے اعظم گڑھ آکر ایک سکول بنوایا جس کا نام نیشنل سکول رکھا۔ کشمیر گئے تو وہاں جا کر بیمار ہو گئے۔ اس وقت شبلی 'الفاروق' لکھ رہے تھے۔ مولوی سید علی بلگرامی نے انہیں حیدر آباد بلالیا۔ اور نظامت علوم و فنون کا عہدہ دلوایا۔ اس دور کی یادگار کتابیں ہیں۔ علم الکلام، سوانح مولانا روم، موازنہ انیس و دبیر، اور الغزالی، یہاں شبلی کی تنخواہ تین سو روپے ماہانہ تھی۔ مولانا شبلی نے دکن میں چار سال قیام کیا۔

۱۸۹۴ء کا زمانہ تھا کہ بعض اہل علم حضرات نے ندوۃ العلماء کے نام سے ایک انجمن کو تشکیل دیا۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد میں عربی مدارس کے نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح اور عام مسلمانوں کی اصلاح بھی شامل تھی۔ بعد ازاں ایک ایسے دارالعلوم کے قیام کی تجویز بھی زیر غور تھی، جہاں مسلمانوں کو جدید اور قدیم علوم و فنون کی تعلیم دی جائے۔ چنانچہ مولوی عبدالعزیز صاحب مدارالمہام ریاست رامپور کی تجویز پر مولانا سید محمد علی صاحب کانپوری کے مبارک ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی گئی۔ اس انجمن کے قواعد و ضوابط شبلی نعمانی اور مولانا عبدالحق صاحب دہلوی نے ترتیب دیئے۔ اس انجمن کے ناظم اعلیٰ مولوی سید محمد علی تھے۔ شبلی نعمانی نے علیگڑھ سے فارغ ہونے کے بعد ندوۃ العلماء کے لئے دن رات محنت کی، لیکن بعض علماء کو ان کے دینی خیالات سے شدید اختلافات تھا چنانچہ اس اختلاف نے بعد میں ایسی صورت اختیار کر لی کہ مولانا شبلی ندوۃ العلماء سے الگ ہو گئے۔ اس موقع کی رنگا کیفیت کو شرر نے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"میں نے اس زمانے میں ان سے کہہ دیا تھا کہ علما بس میں آنے والے نہیں ہیں۔ ان مرحومین امت میں سے ہر ایک صدر کی حیثیت رکھتا ہے اور جس زمانے میں فقط پریذیڈنٹ ہی پریذیڈنٹ ہوں۔ اس پر آیۂ کریمہ صادق آتی ہے کہ (اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دو خدا ہوتے تو یہ دونوں ہی تباہ ہو جاتے) ان کے بہت سے دوستوں نے بھی روکا اور کہا کہ آپ کی ترقی کا میدان علی گڑھ کالج ہی ہے۔ مگر انہوں نے نہ مانا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ گو انہوں نے ندوہ کو بے حد فائدہ پہنچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا۔ مگر آخر ندوہ والے مرحومین امت ہی کے ہاتھ سے مار کھا گئے۔ جس کا ان کے دوستوں کو بے حد ملال ہوا۔ اور وہ بھی اپنی اس محنت کے اکارت جانے پر کف افسوس ملتے ہوئے مرے۔" اس زمانے میں شبلی کا پاؤں اتفاقاً بندوق چل جانے سے شدید زخمی ہو گیا۔ زخم اس قدر بڑھ گیا کہ ڈاکٹروں کو پاؤں کاٹ دینا پڑا۔ اس جانکاہ حادثے کے بارے میں خود مولانا شبلی اپنی کتاب شعر العجم کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"جب موازنہ انیس و دبیر سے بالکل فارغ ہو کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوا۔ اور فردوسی کے حال تک پہنچا تو ۱۰ رمئی ۱۹۰۷ء کو صدمۂ پا کا واقعہ پیش کیا۔ یعنی اتفاق سے میرے پاؤں میں گولی لگی اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا۔ یہ بھی فردوسی کی کرامت تھی۔ کہ واقعہ سے ذرا پہلے شاہنامہ کا یہ مصرع ہم کی زبان پر تھا۔

دوید و برید و شکست و ببست

یہ بڑا دردناک اور اندوہ ناک حادثہ تھا۔ سارے ملک میں اس پر رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ لیکن شبلی نعمانی کی ہمت و استقلال کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے اس صدمے کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور تکلیف دہ عمل جراحی سے گزرے اس موقع پر انہوں نے ایک شعر بھی کہا کہ۔

شبلی نارسیدہ ما بجزائے عملش
پا بگیرند و ندانست کہ سرے بالیست

دارالمصنفین

ندوۃ العلماء سے اپنے شدید اختلافات کی وجہ سے الگ ہونے کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے لکھنؤ کی سکونت ترک کر دی اور واپس اعظم گڑھ آ گئے۔ اعظم گڑھ میں ان کے پاس ایک کشادہ مکان تھا جس کا باغ اور کتب خانہ بڑا وسیع تھا۔ شبلی نے یہاں ایک نئے علمی ادارے دارالمصنفین کی بنیاد رکھی اور اس کیلئے کشادہ مکان، اس کے باغ اور کتب خانے کو وقف کر دیا۔

انتقال

مولانا شبلی نے اپنی کتاب شعر العجم ختم کر لی تھی اور وہ چھپ بھی چکی تھی اس کے بعد انہوں نے ایک عظیم ترین کتاب یعنی سیرۃ النبی پر کام شروع کر دیا۔ یہ اس قدر مقدس اور وسیع تر اور عظیم تر کام تھا کہ وہ اس میں تن من دھن سے مصروف ہو گئے اس کتاب کے بارے میں شبلی خود فرماتے ہیں۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ابھی انہوں نے سیرۃ النبی کی ایک جلد مکمل کی تھی اور دوسری جلد زیر تحریر تھی کہ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شبلی بحیثیت انسان

شبلی نعمانی کے اخلاق و عادات کے بارے میں مولوی حبیب الرحمان خان شیروانی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے اس زمانہ کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریوں سے بالکل پاک و صاف تھے۔ ان کے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا۔ نظر میں بلندی تھی، مزاج میں استغنا، حوصلے میں عزم تھا، مزاج میں نفاست تھی دوستی اور مخالفت دونوں جذبے شدید تھے لیکن دوستوں کی مروت کبھی ان کو رسمی تعلق و چاپلوسی پر آمادہ نہیں کرتی تھی۔ عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے۔ مخالفین کی مخالفت سے دو بدو نہیں رکتے تھے۔ مگر ان کے پس پشت بیان اختلاف میں بھی ان کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت کرتے مخالف کی رائے کی تردید تحقیق کے ساتھ کرتے تھے۔ اپنی رائے کے دلائل کا اظہار زور شور سے کرتے۔ باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا تھا کہ مخالف کے ذاتی یا صفاتی عیوب پیش کر کے اس کو ذلیل و رسوا کرتے۔ صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی۔ انسان خواہ کسی درجہ کا ہو، ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ جس مسئلے پر گفتگو کرتے ان کے کمال کی خوبیاں نظر آتی تھیں، عقل پیرایہ، مؤثر ظریفانہ انداز

شاعرانہ نکتہ سنجی۔ ان کے بیان کی نیچ وہلدم تھی جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوئی، بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کئے۔ فضول باتیں میں نے ان سے کبھی نہیں سنیں۔ اعزہ کے ساتھ بہت الفت تھی۔ اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر پر سوز دل گیری کے ساتھ کیا۔ دوسرے بھائی کی موت تو ان کی جان ہی لے گئی احساس بہت شدید تھا۔ اس لئے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کے زمانے میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے۔ ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے ان کے پاؤں پر ڈنک مار دیا۔ اس قدر بے تاب ہوئے کہ مجھ کو حیرت ہو گئی اس قدر زمانہ گزرنے پر آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے۔ یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا ہر ذوق میں شدت چاہتے تھے۔ نمک تیز کھاتے تھے۔ دسترخوان پر نمک رکھ لیتے اور کھانے میں ڈالتے جاتے۔ شیرینی میں گلوکوز مرغوب تھی یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھا ہوا ہے، باتیں کرتے جاتے ہیں اور قند کے دانے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں۔ وہ قند سے اور سامع ان کے کلام سے شیریں کام ہے۔ ایک مرتبہ جلسہ ندوۃ العلماء کے سلسلے میں بریلی ان کا میرا ساتھ ہوا۔ اس زمانہ میں تندرست تھے۔ تقریباً ہر اسٹیشن پر شیرینی خریدی اور چکھی بلکہ کھائی۔ محض شیریں ہونا کافی تھا۔ اس کے حسن و قبح سے بحث نہ تھی۔ پانی تیز سرد پیتے تھے۔ جاڑوں میں بھی یہی ہوتا تھا اس کے ساتھ سردی اور گرمی محسوس کرتے۔ ایک مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے۔ متعدد رضائیاں اوڑھیں تسلی نہ ہوئی دوسرے روز خاص اہتمام سے لحاف خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا۔ گرمیوں میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پر چلے جاتے تھے اسی سلسلے میں بمبئی کے سفر شعر و سخن کے لئے یادگار رہیں گے چائے سادہ اور گاڑھی پیتے تھے۔ صبح کو نماز کے اوّل وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے۔ عادت میں سادگی تھی، لباس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے۔ غذا بہت کم کھاتے تھے۔

(سیرالمصنفین ۔ شروانی)

شرر ایک مقام پر شبلی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ان میں باوجود انتہا درجے کے اخلاق کے، خودداری کا خیال بہت بڑھا ہوا تھا۔ سید صاحب کی صحبت، علیگڑھ کالج کی مرجعیت اور ان کی ذاتی قابلیت نے انہیں ابتداً اس حیثیت سے پبلک میں متعارف کرایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہمراہ حیدرآباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور پختگی ہو گئی۔ مگر خود مولانا شبلی کی خودداری کو ٹھیس لگی۔ اس حیثیت کو اور اپنی ان تصنیفوں اور نظموں کو وہ مٹا نہ سکتے تھے جن میں خود ہی اپنی حیثیت کو آشکارا کر چکے تھے۔ لیکن اب اس بات کو ناقابل برداشت دیکھ کے علی گڑھ کے علیگڑھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے ندوۃ العلماء میں شرکت کی اور سمجھے کہ اس ذریعہ سے علماء کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے اس درجہ پہ پہنچ جاؤں گا۔ جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے۔"

ایک مقام پر وہ شبلی کے دینی خیالات کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔

"اس موقع پر ان کے خیالات کے متعلق اس نازک انقلاب کا بیان کر دینا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا۔ کہ سر سید دراصل غیر مقلد اور اہل حدیث کے گروہ میں سے تھے، لیکن مسائل کلامی اور انگریزی اثر نے قبر سیّد سے ایک جبری حد تک انہیں معتزلی بنا دیا تھا۔ سید صاحب کی صحبت کا مولانا شبلی پر کوئی اثر نہ ہونا غیر ممکن تھا۔ مگر اہل حدیث کی طرف سے ان کے دل میں جو بھڑک تھی، وہ بھی ممکن نہ تھا کہ انہیں نعمانیت اور حنفیت کے دائرے سے باہر نکلنے دیتی لہذا بغیر اس کے کہ غیر مقلدی کا کچھ بھی رنگ چڑھنے پائے، وہ بلا واسطہ نعمانی سے معتزلی بننے لگے، اور آخر میں اس بات کی کوشش شروع کی کہ خود حنفیت کو اصل اعتزالی ثابت کر دیں اور بخلاف متاخرین حنفیہ کے، حنفیت کو اشعریت کا سخت دشمن اور فقہ کے پردے میں چھپی ہوئی معتزلیت ثابت کرنا چاہا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی طلبہ ان کی باتوں سے خوش ہو ہو کر دینداری اور خوش اعتقادی کے دھوکے میں معتزلی ہونے لگے اور موجودہ علمائے حنفیہ سے ان کو سخت عناد پیدا ہو گیا۔ اسی جوش کا تقاضا یہ بھی تھا کہ امام صاحب کی سوانح عمری انہوں نے "سیرت النعمان" لکھی تو امام المحدثین محمد بن اسماعیل بخاری پر جا بجا حملے کئے اور علی العموم گروہ محدثین کے اصول سے اختلاف کیا کرتے، یہاں تک کہ امام ابوالحسن اشعری بھی محض اتباع حدیث کے باعث ان کے مورد الزام بن گئے۔"

"انسانوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو مذہبی تخیلات رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو مذہب سے بالکل بیگانہ و بے پروا رہتے ہیں۔ اور ایک آزاد دماغ رکھتے ہیں۔ تیسرے وہ جن کے دماغ میں مذہب و آزادی مرکب صورت میں پائی جاتی ہے۔ اس گروہ کی دو شاخیں ہیں، اوّل جن میں مذہب غالب ہے۔ دوم وہ جن میں آزادی قومیت اور عقلیت کا خیال مذہب پر غالب ہے میرے خیال میں شبلی کا شمار آخری گروہ میں ہے۔"

"لیکن وہ آزاد خیالی مذہب ہی کے دائرے میں محدود رکھتے تھے۔ بلکہ اس کو سیاست تک پہنچاتے تھے چنانچہ آخری عمر میں انہوں نے اپنے سیاسی خیالات کو پوشیدہ نہیں رکھا، سرسید احمد خاں مرحوم مذہب میں کچھ کم آزاد خیال نہ تھے لیکن سیاسی معاملات میں وہ زیادہ تر قدامت پسند یا کنسرویٹو واقع ہوئے تھے۔ اس لئے کالج کی پروفیسری کے زمانے میں مولانا شبلی کو سرسید کے سیاسی خیالات سے سخت کراہت تھی، مولوی شبلی نے تین اہم کام انجام دینے کی کوشش کی اور ان میں ایک بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کی، ایک وقف علی الاولاد کا مسئلہ جس کو پہلے بھی لوگوں نے مختلف طریقے سے چھیڑا تھا۔ انہی کی کوشش سے سرسبز ہوا، دوم مولانا کی یہ کوشش تھی کہ حالات زمانہ سے باخبر روشن دماغ اور مفید دینی عالم پیدا ہوں اس کی بنیاد پڑ گئی ہے اور کچھ لوگ مولانا کے نام لیوا ہیں اور انہیں کے طرز کا تحریر میں اتباع کرتے ہیں۔ ان میں تاریخ نویسی اور قومی عصبیت کے ساتھ روحانیت کا بھی مساوی پہلو ملا، تو ہم کہیں گے کہ یہ دوسری کوشش بھی کامیاب ہوئی سوم وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بادشاہوں پر سے تاریخی الزامات رفع کئے جائیں مولانا کو اس معاملہ میں بھی خاصی کامیابی ہوئی۔ ایک شخص کی زندگی میں ایسے عظیم الشان کارنامے اس کو سیکڑوں برس تک زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔"

شبلی کا مقام

محترم عبداللطیف اعظمی اپنے ایک مضمون "مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں" میں لکھتے ہیں کہ آزاد نے اردو زبان و ادب کا سنگ بنیاد رکھا۔ نذیر احمد و حالی نے اس پر بہت کچھ اضافے کئے لیکن اس تعمیر کی تکمیل جس نے کی وہ شبلی کی ذات تھی۔ شبلی کو علم و ادب کا جو ذخیرہ ملا، وہ دینیات، تاریخ، سوانح اور تنقیدات پر مشتمل تھا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ان میں بیش بہا اضافے کئے، بلکہ جدید طرز تصنیف

سے اردو کو آشنا کیا اور یہ صرف شبلی کا کارنامہ ہے کہ اردو اس قابل ہوئی کہ ہندوستان کی علمی زبان کہلا سکے اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھیں ملا سکے۔ شبلی اپنی تحقیقات کے لحاظ سے چاہے تاریخ میں ہو یا ادب و زبان میں اس قدر آگے ہیں کہ ان کے معاصرین میں سے کوئی اُن کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکا۔ مہدی حسن مرحوم نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "آج کل کے مصنفین میں علامہ شبلی کو ایک خاص امتیاز اور فوقیت حاصل ہے جو ان کے ہم عصروں کے حصہ میں نہیں آیا، ان کے سخت سے سخت حریف بھی ان کی تحقیقات کی گرد کو نہیں پہنچے۔ بعضوں نے موضوع سخن ایسا اختیار کیا ہے کہ اگر زمانہ کی رفتار یہی رہی تو زیادہ جیتے معلوم نہیں ہوتے، نذیر احمد اپنی لائقی رنگ عربیت کے ساتھ بھی کچھ یونہی سے رہے۔ حالی نے مدس کے ساتھ مقدمہ شعر و شاعری اور حیات جاوید لکھ کر اپنا ٹھکانا کر لیا۔ شبلی قطعاً غیر فانی ہیں، آج ہزاروں صفحے، متعدد جلدوں میں ان کے قلم سے نکل چکے ہیں اور جس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے کسی زبان میں اس سے بہتر مجموعہ خیال موجود نہیں۔" (افادات مہدی)

مولانا شبلی نے تصنیف و تالیف شروع کرنے سے قبل، ایک طرف اردو کا جائزہ لیا اور بدلتے ہوئے زمانے اور یورپ کی بڑھتی ہوئی ترقی پر نظر ڈالی اور دوسری طرف اسلاف کے علمی کارناموں اور عہدِ دولتِ عباسیہ کی علمی خدمات اور دوسری زبانوں کے تراجم کو بہ نظر غائر دیکھا اور ایک مکمل سکیم مرتب کی۔ مولانا کی اس سکیم کو پڑھیے اور اس کے بعد مولانا کی تصانیف پر نظر ڈالیے تو اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ اس کی صحت اور صداقت صاف ظاہر ہو جائے گی۔ مولانا کی سکیم اور سکیم بناتے وقت جو خیالات اور مقاصد پیش نظر تھے ذیل درج کیے جاتے ہیں۔

"تھوڑی دیر کے واسطے فرض کرنا چاہیے۔ کہ زمانہ اپنی موجودہ ضرورتوں کے ساتھ قائم ہے۔ لیکن بجائے موجودہ نسل کے، ہمارے اسلاف کا علمی گروہ دوبارہ دنیا میں آگیا ہے۔ اس حالت میں غور کرو، اس گروہ کے علمی مہمات کیا ہوں گے؟ اس سوال کا جواب قیاسی اور فرضی نہیں، بلکہ اصول تجربہ کے موافق دیا جا سکتا ہے۔ علمائے سلف اور ان کے علمی کارنامے، دونوں ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ نیز ہر شخص جانتا ہے کہ دولت عباسیہ کے زمانے تک تمام اسلامی علوم بالکل سادگی اور ایک رنگی کی حالت میں تھے۔ دولت عباسیہ کے وجود کے ساتھ جب نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں تو دفعۃً ایک انقلاب ہو گیا۔ سب سے پہلے علماء کا ایک گروہ پیدا ہوا۔ جس نے یونانی، سریانی، کلدانی، ہندی اور قبطی زبانوں کے علوم و فنون ترجمہ کے ذریعے عربی زبان میں منتقل کر دیئے ایک دوسرے گروہ نے ان نمونوں کو سامنے رکھ کر اسلامی علوم کے سادہ ایوان پر مینا کاریاں اور نقش آرائیاں کیں، اعتقاد نے علم کلام کی صورت اختیار کی، عربیت نے معانی و بلاغت کا قالب بدلا۔ اصول فقہ میں منطقی استدلالات پیدا کیے، تفسیر میں فلسفہ کی آمیزش ہو گئی، فرائض میں علم حساب کے دقیق اصول شامل ہو گئے، ان باتوں کے ساتھ علوم قدیمہ کی غلامی نہیں کی۔ بلکہ جو کچھ کیا آزاد اور خود مختار بن کر کیا۔ جہاں غلطیاں دیکھیں اصلاح کی، جو فضول حصہ تھا اس کو الگ کر دیا، پریشان اور غیر مرتب خیالات و مسائل نئے سرے سے درست کیے، جس قدر حصہ اسلامی علوم میں تحلیل ہو سکتا تھا، تحلیل کیا، جو بالکل جدا تھا اس کو مستقل حیثیت سے قائم رکھا۔"

"آج بعینہ اسی قسم کی حالت اور اسی قسم کا موقع ہے۔ یورپ نے تمام علوم و فنون کا قالب بدل دیا ہے۔ فلسفہ نے بالکل نئی صورت اختیار کی ہے منطق میں نئے برگ و بار پیدا ہوئے ہیں، معانی و بلاغت کا اسلوب بدل گیا ہے۔ تاریخ ایک قسم کا فلسفہ بن گئی ہے مذہبی مباحث کے نئے نئے پیرائے نکل آئے ہیں اسی گذشتہ خیال کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج اگر اسلاف موجود ہوتے تو علوم و فنون جدیدہ کو پیش نظر رکھ کر وہی کرتے، جو انہوں نے علوم قدیمہ کے ساتھ کیا تھا۔ علم کلام کو فلسفہ جدیدہ کے مقابلہ میں مرتب کرتے، تاریخ اور واقعہ نگاری کا انداز بدلتے، مسائل جدیدہ کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام علوم و فنون کے متعلق قدیم و حال کی تحقیقات کا موازنہ کرتے اور دونوں کے عیب و ہنر دکھا کر فیصلہ کرتے کہ کیا چیزیں کس حد تک قبول کے قابل ہیں اور ان کی تحقیقات کو علوم قدیمہ کے ساتھ کیوں کر ہم ترکیب جا سکتا ہے" ان کے نمونے پر علوم قدیمہ کی روشنی کیوں کر بدلی جا سکتی ہے ان کی روشنی میں ہم اس قدر معلوم کر سکتے ہیں کہ نئے راستے میں کیوں کر قدم اٹھائیں اور قدیم و جدید راہیں کہاں جا کر مل جائیں گی۔"

شبلی کے ذہن میں جو سکیم تھی اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

۱۔ فلسفہ حال کے اصول اور اس کا معتدبہ حصہ ملکی زبان میں لایا جائے۔

۲۔ یہ بتایا جائے کہ فلسفہ حال کے کون کون سے مسائل مذہب کے خلاف ہیں۔ پھر ان مسائل کو یا رد کیا جائے یا مذہب سے تطبیق دی جائے۔

۳۔ جس قسم کے مضامین پر آج کل یورپ میں تصنیفات ہو رہی ہیں اور جن پر اسلامی تصنیفات بھی موجود ہیں، ان میں موازنہ کر کے بتایا جائے کہ مسلمانوں کا طرز تصنیف کیا تھا اور یورپ کا طرز تصنیف کیا ہے۔ مثلاً تاریخ، اسماء الرجال، معانی و بلاغت، تحقیقات مذہب میں عربی زبان میں کثرت سے تصنیفات موجود ہیں۔ ان ہی مضامین نے یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کیے ہیں موازنہ کر کے بتایا جائے کہ دونوں کی مختلف خصوصیات کیا ہیں اور کسی کو کس حیثیت سے ترجیح ہے۔

۴۔ خالص اسلامی علوم مثلاً کلام، فقہ، اصول، تفسیر، وغیرہ کی تاریخ اور ان پر ریویو لکھا جائے۔ یعنی یہ کہ یہ علوم کب پیدا ہوئے، کیونکر بڑھے، کس کس زمانہ میں کیا کیا باتیں ان پر اضافہ ہوتی گئیں اور کن اسباب سے ہوئیں، ان کا کس قدر حصہ صحیح ہے۔ اور کس قدر تنقید اور اصلاح کا محتاج ہے۔

۵۔ فارسی اور عربی شاعری اور انشا پردازی کی تاریخ لکھی جائے۔

۶۔ جن نئے عنوانوں پر یورپ میں مضامین لکھے جا رہے ہیں اردو زبان میں ترجمہ کے ذریعے لائے جائیں،

۷۔ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر تاریخی مضامین لکھے جائیں، مثلاً انتظام عدالت، انتظام محاصل، پبلک ورکس، تعلیمات، تجارت، فوجی نظم و نسق، معاشرت، غرض اس قسم کے تمام امور کی نسبت مورخانہ طور پر لکھا جائے کہ مسلمانوں نے ان چیزوں میں کہاں تک ترقی کی۔ اور کس کس عہد میں کیا کیا اضافہ ہوا۔

جیسا کہ محترم عبداللطیف اعظمی صاحب اپنے عالمانہ مضمون "مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں"، میں تحریر فرماتے ہیں۔ "شبلی کی یہ سکیم کسی ایک شخص کے بس کی نہیں تھی۔ بلکہ علمائے ادب اور اصحاب قلم کی ایک منتخب جماعت سالہا سال میں اسے پورا کر سکتی تھی۔ مگر شبلی کی جرأت و ہمت ان کے دل و دماغ کی خوبی اور اردو زبان و ادب سے ان کا غیر معمولی عشق ملاحظہ ہو کہ اس اکیلی ذات نے اس سکیم کو عملی جامہ پہنایا۔ اور حق تو یہ ہے کہ شبلی کے علاوہ کوئی اور شخص اس کام کو انجام بھی نہیں دے سکتا تھا۔ یہ صرف شبلی کی ہمہ گیری اور جامعیت تھی کہ اگر ایک طرف مورخ تھے تو دوسری طرف ادیب اور بہترین نقاد، اگر ایک طرف شاعر تھے تو دوسری طرف جید عالم، اگر فلسفۂ قدیم و جدید پر عبور تھا تو تعلیم میں بھی پوری دست گاہ رکھتے تھے۔ غرض علم و ادب کے تمام شعبوں اور تمام اطراف پر شبلی حاوی تھے۔

عناصر اربعہ میں ایک شبلی ایسے شخص تھے جنہیں قدرت کی طرف سے، سب سے کم عمر ملی۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے اتنی کتابیں لکھیں یا بہ الفاظ دیگر اردو زبان و ادب میں انہوں نے اتنا عظیم الشان اضافہ کیا ہے کہ ان کے پیشرو اپنی طویل عمر میں، اس کے نصف بھی اضافہ نہ کر سکے۔ شبلی کی تمام کتابوں پر تبصرہ کرنے اور ان کی خصوصیات اجاگر کرنے کی، اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے مختصراً ان کے نثری کارناموں کا ذکر کیا جائے گا۔

تاریخ وسوانح نگاری

شبلی سے قبل تاریخ کی کتابیں تحقیق سے خالی تھیں۔ اور جدید ذوق و رجحان کا ان میں مطلق خیال نہیں کیا گیا تھا یا تو اتنی خشک تھیں کہ کوئی پڑھنے کی ہمت نہ کر سکے یا دل چسپی کا اس قدر سامان تھا کہ وہ تاریخ کے مقام سے نیچے درجہ رکھتی تھیں۔ مولانا شبلی نے ان تمام نقائص کو دور کیا اور تاریخ کا ایک معیار قائم کیا۔ جدید طرز کے مطابق نئے مباحث پر تحقیقی اور عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی اور یوں تاریخ نگاری کو مغربی تصانیف کے پایہ تک پہنچایا۔ دل چسپی اور شگفتگی اس طرح پیدا کی کہ عوام و خواص دونوں پڑھتے تھے۔ ایک نقاد کا کہنا ہے کہ "اردو ادب کے پیدا کرنے والے تھوڑے ہیں ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آج کل کے وسیع معیار قابلیت کے لحاظ سے اہل قلم کی صف اول میں شامل ہونے کے لائق ہوں۔ سرسید سے قطع نظر کرنے کے بعد جن کو اولیت کا فخر حاصل ہے میرا خیال ہے کہ شبلی بہ لحاظ فن صرف ہندوستان نہیں، بلکہ تمام اسلامی دنیا میں کسی سے دوسرے درجے پر نہیں ہیں۔"

شبلی نے سب سے پہلے مشاہیر اسلام پر لکھنا شروع کیا۔ ان کی اس سلسلے کی پہلی کتاب 'المامون' شائع ہوئی۔ پہلا حصہ ترتیب خلافت، مامون الرشید کی تعلیم و تربیت، تخت نشینی، خانہ جنگیاں، فتوحات ملکی اور وفات تک کے حالات تک کا ہے۔ دوسرے حصے میں ان مراتب کی تفصیل ہے جن سے اس عہد کے ملکی حالات اور مامون الرشید کے اخلاق و عادات کا اندازہ ہو جاتا ہے اس کتاب کے دیباچے میں سرسید احمد خان لکھتے ہیں۔ "پہلے حصے میں شبلی نے تاریخانہ واقعات لکھے ہیں اور نہایت خوبی و اختصار سے دکھایا ہے کہ خلافت کا سلسلہ کیوں کر اور کیوں خاندان بنو امیہ کو برباد کر کے عباسی خاندان میں پہنچا۔ اور کیا اسباب جمع ہوئے جن سے امین اس کا بھائی محروم اور مقتول ہوا، اور خود مامون تمام مملکت اسلامی کا مالک الملک لاشریک لہ بن گیا، جا بجا واقعات، دل چسپ سے بھی اس حصہ کو آراستہ کیا ہے جس کے سبب سے یہ سوکھا اور پھیکا تاریخانہ حصہ نہایت دل چسپ ہو گیا ہے دوسرے حصہ میں انتظام سلطنت، آمدنی، فوجی انتظام و عدالت اور اس کی جزئیات کو جہاں جہاں سے ملیں چن چن کر ایک جگہ جمع کیا ہے اور مامون کی فضیلت اور سوشل حالت، اس کی پرائیویٹ زندگی، اس کے مشغلوں اور مجلسوں کا ذکر ہے، اور اس زمانہ کی زندگی اور طرز معاشرت کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ یہ حصہ نہایت ہی دل چسپ ہے۔ شان اور عظمت اور جلال خلافت کے ساتھ ایسی ایسی سادہ اور بے تکلف باتوں سے بھرا ہوا ہے کہ اس کو اس سے رونق ہوتی ہے اردو زبان نے بہت ترقی کی ہے مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لئے زبان طرز بیان جدا گانہ ہے، تاریخ کی کتابوں میں ناول اور ناول میں تاریخانہ طرز گو کیسی ہی فصاحت اور بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برباد کرتا ہے، ہمارے لائق مصنف (شبلی) نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے، ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دل چسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی حالت پر موجود ہے جو خوب صورت ہے خوبصورت ہے۔ جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے۔ خوبصورتی کو زیادہ خوب صورت بنایا ہے نہ بھونڈے پن کو زیادہ بھونڈا۔ اور در حقیقت یہی کمال تاریخ نویسی ہے۔"

سرسید نے جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ محض المامون کی خصوصیات نہیں ہیں، بلکہ شبلی کی تمام تاریخی کتابوں میں یہ خصوصیات نمایاں طور پر موجود ہیں۔ المامون جس عہد میں لکھی گئی اس زمانے میں شبلی پر سرسید کا اثر تھا، چنانچہ کہیں کہیں بے جا انگریزی کے الفاظ ملتے ہیں، لیکن بعد میں یہ اثر ختم ہو گیا۔

المامون کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

المامون

اس سال ایک عجیب تقریب سے طاہر کو اپنے کارہائے نمایاں کا مناسب صلہ ملا یعنی وہ کل مشرقی حکومت پر جس کی حد دار الخلافہ بغداد سے شروع ہو کر سندھ تک منتہی ہوتی ہے، نائب السلطنت مقرر ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک رات طاہر مامون کی بزم عیش میں حاضر ہوا۔ مامون بادہ نوشی کے مزے لے رہا تھا بے تکلفی سے اُس نے دو پیالے طاہر کو بھی مرحمت کئے اور اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دی۔ طاہر نے باادب عرض کیا کہ میرا منصب اس عزت کا مستحق نہیں ہے، مامون نے کہا یہ قیدیں دربار عام کے لئے مخصوص ہیں۔ بے تکلفی کے جلسوں میں اس قسم کے قواعد کی پابندی ضروری نہیں۔ طاہر آداب بجا لا کر بیٹھ گیا۔ مامون نے اس کی طرف نگاہ کی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ طاہر نے عرض کی کہ اب کیا آرزو باقی رہی ہے جس کا حضور رنج کر سکتے ہیں۔ مامون نے کہا کچھ ایسی بات ہے جس کے پوشیدہ رکھنے میں تکلیف اور ظاہر کرنے میں ذلت ہے۔ طاہر اس وقت تو چپ رہا مگر دل میں خلش پیدا ہوئی کہ آخر کیا بات ہے۔ حسین جو مامون کا ساقی اور ندیم خاص تھا، طاہر نے دو لاکھ درہم اسے نذر بھیجے اور درخواست کی کہ اس دن کے واقعہ کا سبب دریافت کر دے حسین نے موقع پا کر پوچھا، مامون نے کہا اگر یہ بات آگے بڑھی تو سر اڑا دوں گا۔ سچ یہ ہے کہ جب طاہر میرے سامنے آتا ہے تو بھائی امین کا ذلت و بے کسی سے یاد آتا ہے۔ میرے ہاتھ سے ضرور کسی دن طاہر کو گزند پہنچے گا۔ طاہر کو یہ بات معلوم ہوئی تو احمد بن ابی خالد الاحول کے پاس گیا اور کہا کہ تم جانتے ہو کہ میں احسان فراموش نہیں ہوں اور میرے ساتھ بھلائی کرنی فائدے سے خالی نہیں۔ میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مامون کی آنکھ سے دور ہوں۔ احمد بن ابی خالد نے اس کا ذمہ لیا۔ اور دوسرے دن صبح کے وقت مامون کے پاس حاضر ہوا، چونکہ چہرے سے تردد اور پریشانی نمایاں تھی۔ مامون نے پوچھا۔

کیوں کوئی نئی بات ہے؟

احمد :- حضور مجھے تو ساری رات نیند نہیں آئی

مامون :- آخر کیوں؟

احمد :- میں نے سنا ہے کہ حضور نے خراسان کی حکومت غسان کو دے دی۔ جس کے ساتھ مٹھی بھر سے زیادہ آدمی نہیں ہیں۔ اگر ترکوں نے سرحد پر حملہ کیا تو کیا غسان ان کو روک سکے گا؟

مامون :- خیال تو مجھ کو بھی تھا۔ اچھا تم کس کو تجویز کرتے ہو؟

احمد :- طاہر ذوالیمینین سے بہتر کون شخص انتخاب ہو سکتا ہے

مامون :- مگر اس کے خیالات تو باغیانہ ہیں۔

احمد :- اس کا ذمہ دار میں ہوں۔

مامون :- اچھا تم اپنی ذمہ داری پر مقرر کر دو۔

طاہر طلب ہوا اور سند حکومت کے ساتھ ایک کروڑ درہم بھی جو عموماً خراسان کے گورنر کو ملتے تھے عطا ہوئے۔ طاہر نے ایک مہینہ میں ساز و سامان سفر درست کیا۔ اور خراسان روانہ ہوا۔ اس کے بعد طاہر کا بیٹا صاحب الشرطہ مقرر ہوا۔ تقرر کے وقت مامون نے طاہر کے بیٹے کو اپنے سامنے بلایا اور کہا۔ یوں تو ہر شخص اپنی اولاد کی نسبت حسن ظن رکھتا ہے۔ لیکن طاہر نے جو کچھ تمہاری تعریف میں کہا وہ اس سے کم تھا جس کے تم مستحق تھے۔ طاہر نے جب یہ مژدہ سنا کہ اس کا بیٹا مصر کا گورنر ہو گیا ہے۔ تو بیٹے کو ایک نہایت مفصل خط لکھا جو آئین حکومت، انتظام ملکی، رفاہ رعایا کے متعلق ایک نہایت مدبرانہ دستور العمل تھا۔ یہ خط اس قدر مقبول ہوا کہ تمام لوگوں نے اس کی نقلیں لیں۔ خود مامون نے اس کی باضابطہ نقلیں عموماً حکام سلطنت کے پاس بھجوائیں اور کہا کہ طاہر نے دنیا و دین و تدبیر و رائے و سیاست و اصلاح ملک و حفاظت سلطنت و قیام خلافت

کے متعلق کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔

(ب) مامون کے عیش و طرب کے جلسوں میں گو عیاشانہ رنگینی پائی جاتی ہے مگر انصاف یہ ہے کہ یہ جلسے علمی مذاق سے بالکل خالی بھی نہ تھے اس قسم کے جلسے جو شاعرانہ جذبات کو پورے جوش کے ساتھ ابھار دیتے ہیں، اگر متانت اور تہذیب کے ساتھ ہوں تو شعر پر وہ نہایت وسیع اور عمدہ اثر پیدا کرتے ہیں۔ مامون خود سخن سنج اور موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ یاران مجلس بھی عموماً نازک خیال اور نکتہ شناس تھے، بات بات پر شاعرانہ لطیفے ایجاد ہوتے، کبھی موسیقی کی بحث چھڑ جاتی۔ کسی وقت مامون کے فی البدیہہ مصرعوں یا شعروں پر شعرا کی طبع آزمائیوں کا امتحان ہوتا۔ ایک دن بزم عیش آراستہ تھی، بادہ و جام کا دور تھا، بیس عیسائی کنیزیں دیبائے رومی کے لباس میں، گردنوں میں سونے کی صلیبیں، کمر میں زریں زنار، ہاتھوں میں گلدستہ لئے ہوئے بزم میں جلوہ آرا تھیں۔ یہ سماں ایسا نہ تھا کہ مامون دل پر قابو رکھ سکتا۔ بے ساختہ چند اشعار زبان سے نکلے اور احمد بن صدقہ ایک مغنی کو بلا کر شعروں کے گانے کی فرمائش کی۔ احمد کی نغمہ سرائی کے ساتھ کنیزیں ناچنی شروع ہو گئیں ان کی مخمور آنکھیں اور جام شراب مامون کو بدمست کرنے میں یکساں کام دے رہے تھے وہ بالکل سرشار ہو گیا اور حکم دیا کہ ان نازنینوں کے قدم پر تین ہزار اشرفیاں نثار کی جاویں۔

مامون کا چچا ابراہیم، جس کے ادعائے خلافت کا حال پہلے حصے میں گزر چکا ہے اور جو موسیقی کا بڑا استاد اور اس فن میں اسحاق موصلی کی ہمسری کا دعویٰ رکھتا تھا۔ ایک دن بزم عیش میں حاضر تھا مامون کے دائیں بائیں حوروش کنیزیں ایک سُر میں عود چھیڑ رہی تھیں۔ اسحاق بھی حاضر ہوا اور آنے کے ساتھ ہی ٹھٹھک سا گیا۔

مامون :- کیوں اسحاق! کوئی بے اصول آواز کان میں آ رہی ہے؟

اسحٰق :- حضور ہاں۔

مامون :- (ابراہیم کی طرف دیکھ کر، تم اس سوال کا جواب کیا دیتے ہو؟

ابراہیم :- نہیں۔

مامون نے اسحاق کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا۔ اب میں یہ تعین بتا دیتا ہوں کہ اس صف میں کس تار پر غلط مضراب پڑ رہی ہے۔ ابراہیم نے اس طرف کان لگا کر سنا، مگر پھر تمیز نہ ہوئی، اسحاق نے ایک خاص کنیز کی طرف اشارہ کیا کہ وہ تنہا بجائے اور سب ہاتھ روک لیں۔ اب ابراہیم سمجھ گیا اور اپنی ناواقفیت پر نادم ہوا۔

مامون نے کہا۔ ابراہیم! اتنی تاروں کی یکساں اور مشتبہ گونج میں ایک غلط صدا جس کے کان میں کھٹک جائے اور وہ اسی کو تعین بتا دے، تم اس کی ہم سری کا کیوں کر دعویٰ کر سکتے ہو۔ شاید یہ پہلا دن تھا کہ ابراہیم نے صریح لفظوں میں اسحاق کی فضیلت کو تسلیم کر لیا۔"

سیرۃ النعمان

حضرت امام ابو حنیفہ کی زندگی کے حالات پر لکھی گئی یہ کتاب بھی دو حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ میں مختصر سی تمہید کے بعد مآخذ کی ان کتابوں کی فہرست ہے جو امام ابو حنیفہ کے حالات پر لکھی گئی ہیں۔ پھر امام کی ولادت اور نسب، تابعیت کی تحقیق امام کا سن رشد اور تعلیم، ان کے شیوخ حدیث کی تفصیل اور ان کے مختصر تراجم، تعلیم، دربار شاہی سے تعلقات، وفات، ان کی اولاد کی تفصیل، ان کے اخلاق عادات، طرز معاشرت اور عام حالات، ان کے مناظرے، اساتذہ اور علمی مجلس، ان کی شہرت اور ہم عصروں کی ان کی نسبت رائیں وغیرہ ہیں۔ دوسرے حصہ میں تدوین فقہ اور امام صاحب کے طریق اجتہاد پر بحث کی گئی ہے آخر میں ان کے مشہور شاگردوں کے مختصر حالات ہیں۔

پہلے حصے میں صرف تحقیق و مطالعہ کی ضرورت تھی اور یہ جنس شبلی کے یہاں بہت ارزاں ہے۔ دوسرے حصہ میں البتہ شبلی کو اپنی مولوی قابلیت کو کام میں لانا پڑا ہوگا۔ کیونکہ ان مسائل سے جو دوسرے حصہ میں بیان ہوئے ہیں قدیم کتابیں یکسر خالی ہیں۔ اس منزل میں مولف کو خود ہی راہرو اور خود ہی رہنما بننا پڑا ہوگا۔ اب دونوں حصوں میں سے الگ الگ اقتباس درج ذیل ہے۔

الف :- ذہانت و طبّاعی :- امام صاحب کی ذہانت اور طبّاعی عموماً ضرب المثل ہے۔ یہاں تک کہ ان کا اجمالی ذکر بھی کہیں آ جاتا ہے تو ساتھ ہی یہ صفت بھی ضرور بیان کی جاتی ہے۔ علامہ ذہبی نے 'عبر فی اخبار من غبر' میں ان کا ترجمہ بہ نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے تاہم اس فقرے کو نہ چھوڑ سکے کہ "اولاد آدم میں جو نہایت ذکی گزرے ہیں، امام ابو حنیفہ ان میں شمار ہوتے ہیں۔" مشکل سے مشکل مسئلوں میں ان کا ذہن اس تیزی سے لڑتا تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے اکثر موقعوں پر ان کے ہم عصر جو معقولات کے لحاظ سے ان کے ہمسر تھے، موجود ہوتے تھے۔ ان کو اصل مسئلہ بھی معلوم ہوتا تھا، لیکن جو واقعہ در پیش ہوتا تھا، اس سے مطابق کر کے فوراً جواب بتا دینا امام صاحب ہی کا کام تھا۔

ایک شخص کسی بات پر اپنی بیوی سے ناراض ہوا اور قسم کھا کر کہا، جب تک تو مجھ سے نہ بولے گی میں تجھ سے کبھی نہ بولوں گا، عورت تند مزاج تھی، اس نے بھی قسم کھائی اور وہی الفاظ دہرائے جو شوہر نے کہے تھے۔ اس وقت تو غصہ میں کچھ نہ سوجھا۔ مگر پھر خیال آیا تو دونوں کو بہت افسوس ہوا۔ شوہر امام سفیان ثوریؒ کے پاس گیا، اور صورت واقعہ بیان کی۔ سفیان نے کہا قسم کا کفارہ دینا ہوگا۔ اس میں کوئی چارہ نہیں۔ مایوس ہو کر لوٹا اور امام ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہ خدارا آپ کوئی تدبیر بتائیے امام صاحب نے فرمایا، جاؤ شوق سے باتیں کرو۔ کسی پر کفارہ نہیں۔ امام ثوری کو معلوم ہوا۔ تو بہت برہم ہوئے اور امام ابو حنیفہ سے جا کر کہا۔ کہ آپ لوگوں کو غلط مسئلے بتا دیا کرتے ہیں امام صاحب نے اس شخص کو بلا بھیجا اور کہا کہ تم دوبارہ واقعہ کی صورت بیان کر جاؤ اس نے اعادہ کیا۔ امام صاحب سفیان کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا کہ میں نے جو پہلے کہا تھا اب بھی کہتا ہوں۔ سفیان نے کہا۔ کیوں؟ فرمایا۔ جب عورت نے شوہر کو مخاطب کر کے وہ الفاظ کہے تو عورت کی طرف سے بولنے کی ابتدا ہو چکی تھی، پھر قسم کہاں باقی رہی۔ سفیانؒ نے کہا حقیقت میں جو بات آپ کو وقت پر سوجھ جاتی ہے ہم لوگوں کا وہاں تک خیال تک نہیں پہنچتا۔

کوفہ میں ایک شخص نے بڑی دھوم دھام سے ایک ساتھ اپنے دو بیٹوں کی شادی کی، ولیمہ کی دعوت میں تمام اعیان و اکابر کو مدعو کیا، مسعر بن کدام، حسن بن صالح، سفیان ثوری، امام ابو حنیفہؒ شریک دعوت تھے۔ لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ دفعتاً صاحب خانہ بدحواس گھر سے نکلا اور کہا، کہ غضب ہو گیا۔ لوگوں نے کہا، خیر ہے؟ بولا، زفاف کی رات عورتوں کی غلطی سے شوہر اور بیبیاں بدل گئیں، جو لڑکی جس کے پاس رہی وہ اس کا شوہر نہ تھا۔ اب کیا کیا جائے؟ سفیان نے کہا۔ امیر معاویہ کے زمانے میں بھی ایسا ہی اتفاق ہوا تھا۔ اس سے نکاح میں کچھ فرق نہیں آتا۔ البتہ دونوں کو مہر دینا لازم ہوگا۔ مسعر بن کدام حضرت امام ابو حنیفہ کی طرف مخاطب ہوئے کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ شوہر خود میرے سامنے آئیں تو جواب دوں گا۔ لوگ جا کر بلا لائے۔ امام صاحب نے دونوں سے الگ الگ پوچھا کہ رات کو جو عورت تمہارے ساتھ رہی وہ تمہارے نکاح میں رہے تو تم کو پسند ہے؟ دونوں نے کہا۔ ہاں۔ امام صاحب نے کہا تو تم اپنی بیبیوں کو جن سے تمہارا نکاح بندھا تھا۔ طلاق دے دو اور ہر شخص اس عورت سے نکاح پڑھا آئے جو اس کے ساتھ ہم بستر رہ چکی ہے سفیان نے جو جواب دیا۔ اگرچہ فقہ کی رو سے وہ بھی صحیح تھا، کیوں کہ یہ عورت وطی بالشبہ کی ہے جس سے نکاح نہیں ٹوٹتا۔ لیکن امام صاحب نے مصلحت کو پیش نظر رکھا، وہ جانتے تھے کہ موجودہ صورت میں نکاح کو قائم رکھنا غیرت و حمیت کے خلاف ہوگا کسی مجبوری سے زوجین نے تسلیم بھی کیا تو دونوں میں وہ خلوص و اتحاد نہ پیدا ہوگا۔ جو تزویج کا مقصود اصل ہے اس کے ساتھ مہر کی بھی تخفیف ہے کیونکہ خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی جائے تو صرف آدھا مہر لازم آتا ہے۔

لیث بن سعد جو مصر کے مشہور امام تھے ان کا بیان ہے کہ میں ابو حنیفہ کا ذکر اکثر سنا کرتا تھا اور ان کے دیکھنے کا مشتاق تھا۔ حج کی تقریب سے مکہ معظمہ جانا ہوا۔ اتفاق سے ایک مجلس میں پہنچا دیکھا تو بڑا مجمع ہے۔ ایک شخص صدر کی جانب بیٹھا ہوا ہے اور لوگ اس سے مسئلے پوچھ رہے ہیں ایک شخص نے بڑھ کر کہا یا ابا حنیفہ! یہ بھلا موقع تھا کہ میں نے ان کو پہچانا۔ امام ابو حنیفہ اس کی طرف متوجہ ہوئے اس نے کہا، میرا ایک بدمزاج بیٹا ہے اس کی شادی کر دیتا ہوں۔ بیوی کو طلاق دے دیتا ہے۔ لونڈی خرید دیتا ہوں تو آزاد کر دیتا ہے۔ فرمایئے کیا تدبیر کروں؟ امام ابو حنیفہ نے برجستہ کہا۔ تم اس کو ساتھ لے کر بازار میں جہاں لونڈیاں بکتی ہیں جاؤ۔ جو لونڈی پسند آئے خرید کر اس کا نکاح پڑھا دو۔ اب اگر وہ اسے آزاد کر دے گا تو نہیں کر سکتا، کیونکہ لونڈی اس کی ملک نہیں۔ طلاق دے گا تو تمہارا کچھ نقصان نہیں۔ تمہاری لونڈی کہیں گئی نہیں۔ سعد کہتے ہیں کہ مجھ کو جواب پر تو کم مگر حاضر جوابی پر بہت تعجب ہوا۔

ربیع جو خلیفہ منصور کا عرض بیگی تھا، امام ابو حنیفہ سے عداوت رکھتا تھا۔ ایک دن امام صاحب حسب الطلب دربار میں گئے۔ ربیع حاضر تھا منصور نے کہا حضور! یہ شخص امیر المومنین کے جد بزرگوار عبداللہ بن عباس کی مخالفت کرتا ہے ان کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم کھائے اور وہ ایک روز بعد انشاء اللہ کہے تو وہ قسم میں داخل سمجھا جائے گا۔ اور قسم کا پورا کرنا کچھ ضرور نہ ہو گا ابو حنیفہ اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انشاء اللہ کا لفظ قسم کے ساتھ ہو، تو البتہ جز قسم سمجھا جائے گا ورنہ لغو اور بے اثر ہے۔

ب :۔ ان مباحث کے بعد ہم اب ان خصوصیتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جن کی وجہ سے حنفی فقہ کو دوسرے فقہوں کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے

سب سے مقدم اور قابل قدر خصوصیت جو فقہ حنفی کو حاصل ہے وہ مسائل کا اسرار اور مصالح پر مبنی ہونا ہے۔ احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قائم ہو گئے۔ ایک گروہ کی یہ رائے ہے کہ یہ احکام تعبدی احکام ہیں یعنی ان میں کوئی سر یا مصلحت نہیں مثلاً شراب خوری یا فسق و فجور صرف اس لئے ناپسندیدہ ہیں کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے اور خیرات و زکوٰۃ صرف اس لئے مستحسن ہیں کہ شارع نے ان کی تاکید کی ہے۔ ورنہ یہ افعال فی نفسہ برے یا بھلے نہیں امام شافعی کا اس طرف میلان پایا جاتا ہے اور شاید اسی کا اثر تھا کہ ابو الحسن اشعری نے جو شافعیوں میں علم کلام کے بانی ہیں، علم کلام کی بنیاد اسی مسئلہ پر رکھی ہے۔

دوسرے فرقے کا مذہب ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں، البتہ بعض مسائل ایسے ہیں جن کی مصلحت عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن درحقیقت وہ مصلحت سے خالی نہیں ہیں یہ مسئلہ اگرچہ بوجہ اس کے کہ اس کے دونوں پہلو بڑے بڑے علماء نے اختیار کئے ہیں ایک معرکہ آرا مسئلہ بن گیا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ اس قدر بحث و اختلاف کے قابل نہ تھا۔ تمام مہمات مسائل کی مصلحت اور غایت خود کلام الٰہی میں مذکور ہے۔

امام ابو حنیفہ کا یہی مذہب تھا اور یہ اصول ان کے مسائل فقہ میں عموماً مرعی ہے۔

الفاروق

یہ کتاب نامور فرمانروایان اسلام کی سب سے پہلی کتاب ہے لیکن یہ المامون کے بعد لکھی گئی اس کتاب پر شبلی نے چار برس صرف کئے یہ کتاب ۱۸۹۰ء میں لکھنی شروع کی اور ۱۸۹۸ء میں ختم ہوئی یہ وہ زمانہ ہے جب مولانا شبلی بیمار تھے۔ اور بیماری ہی کی حالت میں اس کی آخری سطور تلمبند کی گئیں۔ اس کتاب کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کے حالات ہیں ملکی اور غیر ملکی فتوحات ہیں اور دوسرے حصے میں ان کے ذاتی کمالات اور ملکی انتظامات ہیں۔ الفاروق بعض اعتراضات کے باوجود ایک جامع اور مکمل کتاب ہے۔ دونوں حصوں کے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔ "دو ہزار دیل و جلال نے اجب پر حملہ کیا اور زخم کھا کر بھاگا تو تمام ہاتھی اس کے پیچھے بھر لئے اور دم کی دم میں یہ سیاہ بادل بالکل چھٹ گیا۔ اب بہادروں کو حوصلہ آزمائی کا موقع ملا اور اس زور کا رن پڑا کہ نعروں کی گرج سے زمین دہل دہل پڑتی تھی چنانچہ اسی مناسبت سے اس معرکہ کو لیلۃ الہریر کہتے ہیں۔ ایرانیوں نے فوج نئے سرے سے ترتیب دی۔ قلب میں اور دائیں بائیں تیرہ تیرہ صفیں قائم کیں۔ مسلمانوں نے بھی تمام فوج کو سمیٹ کر یک جا کیا۔ اور آگے پیچھے تین پرے جمائے۔ سب سے آگے سواروں کا رسالہ، ان کے بعد پیدل فوجیں اور سب سے پیچھے تیر انداز، سعد نے حکم دیا تھا کہ تیسری تکبیر پر حملہ کیا جائے گا۔ لیکن ایرانیوں نے جب تیر برسانے شروع کئے تو قعقاع سے ضبط نہ ہو سکا اور اپنے رکاب کی فوج لیکر دشمن پر ٹوٹ پڑے فوجی اصول کے لحاظ سے یہ حرکت نافرمانی میں داخل تھی تاہم لڑائی کا ڈھنگ اور قعقاع کا جوش دیکھ کر سعد کے منہ سے بے اختیار نکلا کہ اے خدا قعقاع کو معاف کرنا اور اس کے مددگار رہنا۔ سعد ہر قبیلے کے حملے پر کہتے جاتے تھے کہ خدا اس کو معاف کرنا اور یاور رہنا، اوّل اوّل سواروں کے رسالے نے حملہ کیا۔ لیکن ایرانی فوجیں جو دیواروں کی طرح جمی کھڑی تھیں۔ اس ثابت قدمی سے لڑیں کہ گھوڑے آگے نہ بڑھ سکے۔ یہ دیکھ کر سب گھوڑوں سے کود پڑے اور پیادہ حملہ آور ہوئے۔

ایرانیوں کا ایک رسالہ سر تا پا لوہے میں غرق تھا قبیلہ حمیر نے اس پر حملہ کیا۔ لیکن تلواریں زرہوں پر اچٹ اچٹ کر رہ گئیں، سردار قبیلہ نے للکارا سب نے کہا تلواریں زرہوں پر کام نہیں دیتیں اس نے غصے میں آ کر ایک ایرانی پر برچھے کا وار کیا کہ کمر کو توڑ کر نکل گیا۔ یہ دیکھ کر اوروں کو بھی ہمت ہوئی اور اس بہادری سے لڑے کہ رسالے کا رسالہ برباد ہو گیا تمام رات ہنگامہ کارزار گرم رہا۔ لوگ لڑتے لڑتے تھک کر چور ہو گئے تھے اور نیند کے خمار میں ہاتھ پاؤں بیکار ہوئے جاتے تھے۔ اس پر بھی جب فتح و شکست کا فیصلہ نہ ہوا تو قعقاع نے سرداران قبائل میں سے چند نامور بہادر انتخاب کئے اور سپہ سالار فوج (رستم) کی طرف رُخ کیا۔ سوار گھوڑوں پر سے کود پڑے اور تیر و کمان پھینک کر تلواریں گھسیٹ لیں، اس جوش کے ساتھ تمام فوج سیلاب کی طرح بڑھی اور فیرزان و ہرمزان کو دباتے ہوئے رستم کے قریب پہنچ گئی۔ رستم تخت پر بیٹھا فوج کو لڑا رہا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر تخت سے کود پڑا اور دیر تک مردانہ وار لڑتا رہا۔ جب زخموں سے بالکل چور ہو گیا تو بھاگ نکلا۔

ہلال نام کے ایک سپاہی نے تعاقب کیا۔ اتفاق سے ایک نہر سامنے آ گئی رستم کود پڑا کہ تیر کر نکل جائے گا۔ ساتھ ہی ہلال بھی کود گئے اور ٹانگیں پکڑ کر باہر کھینچ لائے۔ پھر تلوار سے کام تمام کر دیا۔ ہلال نے لاش خچروں کے پاؤں میں ڈالی اور تخت پر چڑھ کر پکارے۔ رستم کا میں نے خاتمہ کر دیا۔ ایرانیوں نے دیکھا کہ سپہ سالار تخت پر نہیں ہے تو تمام فوج میں بھاگڑ مچ گئی مسلمانوں نے دور تک تعاقب کیا۔ اور ہزاروں لاشیں میدان میں بچھا دیں۔"

الفاروق کے دوسرے حصے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"حدیث کے متعلق پہلا کام جو حضرت عمر نے کیا، یہ تھا کہ روایتوں کی تفحص اور تلاش پر توجہ کی آنحضرتؐ کے زمانے میں احادیث کے استقصا کا خیال نہیں کیا گیا تھا جس کو کوئی مسئلہ پیش آتا تھا خود آنحضرتؐ سے دریافت کر لیتا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ کسی ایک صحابی کو فقہ کے تمام ابواب کے متعلق حدیثیں محفوظ نہ تھیں حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں زیادہ ضرورتیں پیش آئیں۔ اس لئے مختلف صحابہ سے استفسار کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور احادیث سے استقرا کا راستہ نکلا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں چونکہ زیادہ کثرت سے واقعات پیش آئے کیونکہ فتوحات کی وسعت اور نو مسلموں کی کثرت نے سینکڑوں نئے مسائل پیدا کر دیئے تھے اس لحاظ سے انہوں نے احادیث کی زیادہ تفتیش کی تاکہ یہ مسائل آنحضرت کے اقوال کے موافق طے کئے جائیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب کوئی نئی صورت پیش آتی تو حضرت عمرؓ مجمع عام میں جس میں اکثر صحابہ موجود ہوتے تھے، پکار کر کہتے کہ اس مسئلے کے متعلق کسی کو کوئی حدیث معلوم ہے؟

یہ تمام بحث تدوینِ مسائل کی حیثیت سے تھی لیکن فنِ فقہ کے متعلق حضرت عمرؓ کا اصلی کارنامہ اور چیز ہے انہوں نے صرف یہ نہیں کیا کہ جزئیات کی تدوین کی بلکہ مسائل کی تفریع و استنباط کے اصول اور ضوابط قرار دیئے جس کو آج کل اصولِ فقہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ آنحضرتؐ سے جو اقوال و افعال منقول ہیں وہ کلیۃً مسائل کا ماخذ ہو سکتے ہیں یا ان میں کوئی تفریق ہے شاہ ولی اللہ صاحب نے اس بحث پر حجۃ اللہ البالغہ میں ایک نہایت مفید مضمون لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو منصبِ نبوت سے تعلق رکھتے ہیں ان کی نسبت خدا کا ارشاد ہے کہ پیغمبرؐ جو چیز تم کو دے وہ لے لو اور جس چیز سے روکے اس سے باز رہو۔ چنانچہ خود آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ یعنی میں آدمی ہوں۔ اس لئے جب میں دین کی بابت کچھ حکم دوں تو اس کو لو اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو بس ایک آدمی ہوں۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے طب کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا۔ جو افعال آنحضرتؐ سے عادۃً صادر ہوئے نہ عبادۃً یا اتفاقاً صادر ہوئے نہ قصداً۔ جو باتیں آنحضرتؐ نے مزعومات عرب کے موافق بیان کیں، مثلاً ام زرع کی حدیث اور خرافہ کی حدیث۔ جو باتیں کسی جزئی مصلحت کے موافق اختیار کیں مثلاً لشکر کشی اور اس قسم کے اور بہت سے احکام، یہ سب دوسری قسم میں داخل ہیں شاہ ولی اللہ صاحب نے حدیث کے مراتب میں جو فرق بتایا اور جس سے کوئی صاحبِ نظر انکار نہیں کر سکتا اس تفریقِ مراتب کے موجد دراصل حضرت عمرؓ ہیں کتب سیر اور احادیث میں تم نے اکثر پڑھا ہوگا کہ بہت سے ایسے موقعے پیش آئے کہ جناب رسول اللہ صلعم نے کوئی کام کرنا چاہا، کوئی بات ارشاد فرمائی تو حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف رائے ظاہر کی مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرتؐ نے عبداللہ بن ابی کے جنازے کی نماز پڑھنی چاہی تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ اس منافق کے جنازے پر نماز پڑھتے ہیں قیدیانِ بدر کے معاملے میں ان کی رائے بالکل آنحضرتؐ کی تجویز سے الگ تھی حضرت عمرؓ کو اس امتیازِ مراتب کی جرأت اسی وجہ سے ہوئی کہ آنحضرتؐ کے متعدد احکام میں انہوں نے دخل دیا تو آنحضرتؐ نے اس پر ناپسندیدگی نہیں ظاہر کی بلکہ متعدد معاملات میں حضرت عمرؓ کی رائے کو اختیار فرمایا اور بعض موقعوں پر تو خود وحی الٰہی نے حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی۔

سفرنامہ روم و مصر و شام

جس زمانے میں شبلی ہیروز آف اسلام کے بارے میں لکھ رہے تھے تو انہیں خیال آیا کہ ہندوستان میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے وہ اس مقصد کے لئے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس مقصد کے لئے مصر و شام کا سفر اختیار کیا۔ واپس آکر مولانا نے سفرنامہ روم و مصر کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی جس میں قسطنطنیہ، بیروت اور بیت المقدس و قاہرہ کے عام حالات، قابلِ دید مقامات، مشہور تاریخی عمارتیں، سررشتۂ تعلیم، دارالعلوم اور مدارس و دارالاقامہ کی زندگی، عام طلبہ کی تعلیم و تربیت، تعلیمِ نسواں، اہلِ قلم، کتب خانے، اخبارات و رسائل، مشہور بادشاہوں اور اربابِ کمال سے ملاقات، ترکوں اور عربوں کے اخلاق و عادات وغیرہ بڑی تفصیل سے لکھے ہیں اور آخر میں بعض عربی الفاظ کی مختصر سی فرہنگ بھی دی ہے تمہید میں مولف نے بتایا ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں ترکوں کی تہذیب و شائستگی کا جو درجہ قائم ہوگا وہ اس سے مختلف ہوگا جو یورپ کے عام لٹریچر سے ظاہر ہوتا ہے موصوف نے یورپین مصنفین کے عام تعصب کا بھی ذکر کیا ہے اور ترکی کے ان سفرناموں کی غلطیوں کے اسباب بھی لکھے ہیں جو یورپ کی تاریخی تصانیف کا سرمایہ ہیں اور جن کی بنیاد پر یورپ نے اپنی تحقیقات کی عمارت کھڑی کی ہے اب اس کتاب کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"چونکہ عام طور پر مشہور ہے کہ جہاز پر پرند جانور ذبح نہیں کئے جاتے اور مولوی مسیح اللہ خاں صاحب نے اپنے سفرنامہ میں تجربہ سے اس کی تصدیق بھی کی ہے میں نے دو تین روز تک پرندے کے گوشت کھانے سے پرہیز کیا۔ مسٹر آرنلڈ نے کپتان سے اس کا سبب دریافت کیا۔ میں نے کہا۔ کہ ہمارے مذہب میں منخنقہ حرام ہے۔ بولے۔ کہ اس جہاز پر پرند ذبح کئے جاتے ہیں۔ گردن مروڑ کر مارے نہیں جاتے چونکہ شرعاً ان کی تنہا شہادت کافی نہ تھی۔ میں خود گیا اور اس کی تصدیق کی۔ ذبح کرنے والا عیسائی تھا۔ وہ ذبح کرنے کے وقت کچھ پڑھتا نہ تھا صرف گردن پر چھری پھیر دیتا تھا اگرچہ حنفیوں کے ہاں یہ ذبیحہ حلال نہیں لیکن اس مسئلہ میں چند دنوں کے لئے میں شافعی بن گیا۔ جن کے ہاں ہر طرح کا ذبیحہ جائز ہے۔

عدن سے چونکہ دلچسپی کے نئے سامان پیدا ہو گئے تھے اس لئے ہم بڑے لطف سے سفر کر رہے تھے لیکن دوسرے ہی دن ایک پُرخطر واقعہ پیش آیا جس نے تھوڑی دیر کے لئے مجھ کو سخت پریشان رکھا۔ دس مئی کی صبح کو میں سوتے سے اٹھا۔ تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے۔ اور اس کی درستی کی تدبیر میں کر رہے تھے۔ انجن بالکل بیکار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا۔ میں سخت گھبرایا۔ اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا۔ دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے میں نے ان سے کہا۔ آپ کو کچھ خبر بھی ہے۔ بولے۔ کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں۔ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا کیا موقعہ ہے؟

فرمایا۔ کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے۔ تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابلِ قدر وقت کو رائیگاں کرنا بے عقلی ہے۔ ان کے استقلال اور جرأت سے مجھ کو بھی اطمینان ہوا۔ آٹھ گھنٹے کے بعد انجن درست ہوا۔ اور بدستور چلنے لگا۔

پورٹ سعید پر سفر کی حالت میں جو تغیر ہوا وہ یہ تھا۔ کہ بمبئی سے پورٹ سعید تک جہاز پر کوئی مسلمان نہ تھا۔ یہاں پہنچ کر دو ایک مسلمان نظر آئے اور بیروت میں تو سارا جہاز شامی عربوں سے بھر گیا۔ میں بڑے شوق سے ان کے پاس گیا۔ لیکن وہ مطلقاً متوجہ نہ ہوئے جس شخص کے پاس کھڑا ہوا۔ اس نے ایک بار آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن نیچی کر لی۔ مجھ کو اس بداخلاقی پر سخت تعجب ہوا۔ دل میں کہتا تھا۔ کہ عربوں کی مہمان نوازی کی یہ کچھ تعریفیں سنی تھیں۔ ان کو تو بات چیت میں بھی مضائقہ ہے۔ ان میں مدرسہ حربیہ کے چند طلبہ تھے۔ جو رخصت لیکر وطن میں آئے تھے۔ اور اب قسطنطنیہ جا رہے تھے۔ وہ کبھی دل بہلانے کے لئے عربی دیوان پڑھا کرتے تھے میں نے خیال کیا۔ کہ ہم فنی کے ذریعہ سے تعارف پیدا کروں، چنانچہ ان کے پاس گیا اور دل در معقولات کے طور پر اپنی مولویت اور علمیت جتانی شروع کی وہ اس پر بھی متوجہ نہ ہوئے۔ میں اپنا سا منہ لیکر چلا آیا۔ لیکن مجھ کو یقین تھا، کہ اس واقعہ کا ضرور کوئی سبب ہے۔ اتفاقاً ایک موقع پر ایک شخص نے میرا مذہب پوچھا۔ میں نے۔ اسلام۔ بولا۔ لا واللہ ہذا طربوش العجم۔ یعنی ہرگز نہیں۔ لیکن مسلمان کبھی ایسی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ بدقسمتی سے میرے سر پر ایرانی ٹوپی تھی اور اس وجہ سے تمام عرب مجھ کو مجوسی سمجھتے تھے، یہ معمہ جب حل ہوا۔ تو میں نے ان لوگوں کے دل سے اس بدگمانی کو رفع کر دیا۔ اور پھر وہ ایسے شیر و شکر ہوئے کہ ایک دم کو مجھ سے جدا ہونا نہ چاہتے تھے"۔

"قسطنطنیہ کا ذکر ہے کہ ایک دن شیخ علی ظبیان جن کے والد ایک مشہور مولوی ہیں شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے۔ میں بھی اس وقت موجود تھا اور اتفاق سے رسالہ اسکات المعتدی جو میری قدیم تصنیف ہے۔ اور عربی زبان میں ہے۔ سامنے رکھا ہوا تھا انہوں نے اٹھا کر دیکھا۔ اور کہا۔ کہ آہا۔ یہ رسالہ مدت ہوئی۔ میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا اور انہوں نے اس مصنف کی نسبت کہا تھا للہ درہ صاحبنا۔ شیخ علی ظبیان کو معلوم ہوا۔ کہ وہ رسالہ میری ہی تصنیف ہے۔ تو اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے۔ مجھ کو

اِس بات سے کہ میری ناچیز تصنیف یہاں تک پہنچی۔ اور لوگوں نے اِس کو نگاہِ قبول سے دیکھا، نہایت مسرت ہوئی اور سفر کی کسمپرسی میں اتنا ذریعۂ تعارف بہت غنیمت معلوم ہوا۔"

"قسطنطنیہ کے احباب کا ذکر کرتے ہیں۔ شام کو ہم تین چار آدمی ایک قہوہ خانے میں جو عین لب دریا ہے۔ ساتھ بیٹھا کرتے تھے اور عجب لطف و مزہ کی صحبت رہتی تھی کبھی کبھی مغرب کے بعد کشتی کرایہ کرتے اور سمندر کی سیر کرتے پھرتے، ندوکو گانا آتا تھا مزے میں آ کر عربی گیت گایا کرتے ایک دن مجھ سے فرمائش کی کہ کوئی ہندی چیز سناؤ میں نے ہر چند کہا۔ کہ بھائی میں مولوی آدمی ہوں۔ مجھ کو گانے سے کیا واسطہ۔ لیکن وہ کب مانتے تھے آخر مجبور ہو کر میں نے اردو کے دو شعر آواز کو گھٹا بڑھا کر پڑھے اور کہا۔ ہندی میں یوں ہی گاتے ہیں۔

(غازی عثمان پاشا کی ملاقات اور تمغۂ مجیدی کا عطا ہونا۔)

یہ وہی نامور جرنل ہے جس نے پلونا میں چھبیس ہزار مجروح اور آٹھ ہزار تہ تیغ کئے تھے۔ جس کے مقابلہ میں شہنشاہِ روس نے اپنی کل فوجی قوت صرف کر دی تھی اور خود سپہ سالار بن کر گیا تھا جس نے باوجود فوج کی کمی اور رسد کی قلت کے روس کی مجموعی طاقت کا مدت تک مقابلہ کیا اور میدانِ جنگ میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔ تو خود شہنشاہ روس نے اس کی کمر میں تلوار باندھی اور مہینوں تک اپنا مہمان رکھا۔

میں ایک مترجم کو ساتھ لیکر ان کے مکان پر گیا۔ گھنٹی بجانے پر دروازہ کھلا۔ دربان نے اندر آنے کی اجازت دی۔ تھوڑی دیر کے بعد پاشائے موصوف تشریف لائے۔ جن صاحب کو میں نے مترجمی کے لئے ساتھ لے لیا تھا۔ سررشتہ تعلیم کے ایک افسر تھے انہوں نے حسبِ قاعدہ آگے بڑھ کر پاشائے موصوف کے دامن کا کنارہ چوما۔ اور مودبانہ طور سے پیچھے ہٹے۔ میں نے طریقۂ سنت کے موافق سلام کیا۔ پاشائے موصوف نے سلام کا جواب دیا۔ اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مزاج پرسی کے بعد نام اور مقام پوچھا۔ مترجم نے کہا۔ کہ ہندوستان کے علماء میں سے ہیں اور تحقیقاتِ علمی کی غرض سے آئے ہیں یہ سنکر نہایت مہربانی اور توجہ ظاہر کی۔ اور دیر تک مسلمانوں کے حالات پوچھتے رہے۔ رخصت ہو کر میں اٹھا۔ تو خود بھی اٹھے۔ اور کہا۔ آپ دوبارہ تشریف لائیں۔ تو مجھ کو خوشی ہو گی دوسری دفعہ ملاقات کو گیا۔ تو پہلے سے کمرے میں آ بیٹھے۔ میں اندر داخل ہوا۔ تو کرسی سے اٹھ کر دو ایک قدم بڑھے اور پہلے دن کی طرح ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد میں جب ان سے ملا تو اسی طریقہ سے ملا۔ پاشائے موصوف مجھ پر نہایت مہربان ہو گئے تھے۔ جب میری روانگی کا زمانہ قریب آیا اور میں نے ان سے کہا۔ کہ اب میں یہاں دو چار روز کا مہمان ہوں۔ تو فرمایا۔ ایک دو دن جانے سے پہلے مجھ سے مل لینا۔ اسی اثنا میں انہوں نے سلطان سے میرے لئے تمغۂ مجیدی عطا ہونے کی درخواست کی۔ اور منظور ہو گئی۔ لیکن مجھ کو اس کی کچھ اطلاع نہ تھی۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے مکان میں سو رہا تھا۔ کہ میرے ایک دوست دوڑے ہوئے آئے۔ اور جگا کر کہا۔ کہ یا شبلی! واللہ لقد طلع لک النیشان۔ مجھ کو ایک گونہ تعجب ہوا۔ اور میں نے کہا۔ یوں ہی کہتے ہو۔ تم کو معلوم کیوں کر ہوا۔ بولے کہ تمام اخبارات میں چھپ گیا ہے۔ میں اسی وقت اٹھا۔ اور ایک قرأت خانے میں جا کر اخبار دیکھے۔ تو واقعی وہ خبر صحیح تھی۔ اس وقت مجھ کو خیال پیدا ہوا۔ کہ میں انگریزی رعیت ہوں۔ اس لحاظ سے انگلش سفیر کو اس کی اطلاع دینی ضرور ہے۔ دوسرے دن میں سفیر کے پاس گیا۔ اتفاق سے وہ مکان پر نہ تھے میں اپنا کارڈ چھوڑ آیا۔ دوسرے دن تمام احباب مبارکباد کو آئے۔ میں نے ایک مختصر جلسۂ دعوت ترتیب دیا۔ شیخ علی ظبیان۔ عبدالسلام آفندی، نواد، شامی، شریف اور دیگر احباب شریک جلسہ تھے۔ دعوت کی صبح کو عثمان پاشا کی وداعی ملاقات کو گیا۔ تمغہ کی خبر ایسی عام ہو گئی تھی کہ پاشائے موصوف کے مکان پر پہنچا۔ تو سب سے پہلے دربان نے کہا "تمغۂ مجیدی مبارک۔" مجھ کو تعجب ہوا کہ اس کو کیوں کر خبر ہوئی! معلوم ہوا۔ کہ یہاں امرا اور پاشاؤں کے نوکر چاکر عموماً پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ اور فرصت کے اوقات میں اخبارات پڑھا کرتے ہیں۔ پاشا موصوف نے ملاقات کے ساتھ تمغہ کی مبارکباد دی، تمغہ سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ بکس سے نکال کر پہلے انہوں نے آنکھوں سے لگایا پھر مجھ کو حوالے کیا۔ میں سرو قد کھڑا ہو گیا اور سلطان کو دعا دی!!

علومِ جدیدہ اور مذہب

یونان میں فلسفہ ایک مجموعہ کا نام تھا۔ جس میں طبیعیات، منصریات، فلکیات، الٰہیات، مابعدالطبیعیات سب کچھ شامل تھا۔ لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اس کے دو حصے کر دیئے جو مسائل مشاہدہ اور تجربے کی بناء پر قطعی اور یقینی ثابت ہو گئے، ان کو سائنس کا لقب دیا جو مسائل تجربہ اور مشاہدہ کی دسترس سے باہر تھے۔ ان کا نام فلسفہ رکھا۔

مسائل جدیدہ کی نسبت یہ عام خیال جو پھیلا ہوا ہے۔ کہ وہ قطعی اور یقینی ہیں ان میں پہلی غلطی یہ ہے۔ کہ جو چیزیں قطعی اور یقینی ہیں۔ وہ صرف سائنس کے مسائل ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یورپ میں ان کی نسبت طبقۂ علماء میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ لیکن فلسفہ کی یہ حالت نہیں ہے۔ یورپ میں آج فلسفہ کے بیسیوں اسکول ہیں اور ان میں شدت سے اختلاف ہے۔ اگر ان سب کو صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا۔ کہ ایک ہی چیز سفید بھی ہو سکتی ہے اور سیاہ بھی۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ سائنس کو مذہب سے کیا تعلق ہے، سائنس جن چیزوں کا اثبات یا ابطال کرتا ہے۔ مذہب کو اُن سے مطلق سروکار نہیں۔ عناصر کس قدر ہیں؟ پانی کن چیزوں سے مرکب ہے؟ ہوا کا کیا وزن ہے؟ نور کی کیا رفتار ہے؟ زمین کے کس قدر طبقات ہیں؟ یہ اور اس قسم کے مسائل ہیں۔ مذہب کو اُن سے کچھ سروکار نہیں۔ مذہب جن چیزوں سے بحث کرتا ہے وہ یہ ہیں۔

خدا موجود ہے یا نہیں؟ مرنے کے بعد کسی قسم کی زندگی ہے یا نہیں، خیر و شر یا نیکی و بدی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ ثواب و عتاب ہے یا نہیں؟ ان میں سے کون سی چیز ہے۔ جس کو سائنس ہاتھ لگا سکتا ہے، سائنس کے اساتذہ نے جب کہا ہے۔ تو یہ کہا ہے، کہ ہم کو ان چیزوں کا علم نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ چیزیں مشاہدہ اور تجربہ کے احاطہ سے باہر ہیں۔ یا یہ کہ ہم ان باتوں کا یقین نہیں کرتے کیونکہ ہم صرف ان باتوں کا یقین کرتے ہیں۔ جو تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہو سکتی ہیں مگر [illegible] نفسیہ [illegible] علم سے جو مسلم علوم سمجھے جاتے ہیں، سائنس والے کہتے ہیں کہ ہم کو یہ چیزیں معلوم نہیں۔ گویا وہ بین الکل کے یہ کہتے ہیں۔ کہ ہم کو ان چیزوں کا نہ ہونا معلوم ہے۔ حالاں کہ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

غلط مبحث اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب سائنس اور مذہب دونوں میں کوئی اپنی حد سے بڑھ کر دوسرے کی حد میں قدم رکھتا ہے۔ اور یہی غلط مبحث تھا جس نے ملاحدہ اور منکرینِ مذہب کے خیال کو قوت دی۔ بلکہ درحقیقت اسی غلط مبحث نے الحاد اور بے دینی کے خیالات پیدا کر دیئے۔ یورپ میں پہلے مذہب کو اس قدر وسیع کر دیا گیا تھا۔ کہ کسی قسم کا کوئی علمی مسئلہ مذہب کی دست اندازی سے بچ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ خاص اس مقصد کی غرض سے اسپین میں مجلس انکوزیشن (محکمۂ احتساب عقائد) قائم ہوئی تھی۔ جس کا کام یہ تھا۔ کہ جو لوگ مذہب کے خلاف کچھ کہتے ہوں ان کی تحقیقات کرے، اور ان پر کفر اور ارتداد کا الزام لگائے چنانچہ اٹھارہ برس میں یعنی ۱۴۸۱ء سے لیکر ۱۴۹۹ء تک دس ہزار دو سو بائیس آدمی۔ ارتداد کے الزام میں زندہ آگ میں جلا دیئے گئے۔ اس مجلس نے ابتدائے قیام سے آخیر زمانہ تک تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو کافر اور ملحد قرار دیا جن میں سے کئی لاکھ آگ میں جلا دیئے گئے۔

جس قسم کی باتوں پر کفر کا الزام لگایا جاتا تھا۔ اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہو گا کوپرنیکس نے نظامِ بطلیموس سے انکار کر کے یہ ثابت کیا۔ کہ زمین اور چاند وغیرہ آفتاب کے گرد گھومتے ہیں۔ اس پر مجلس انکوزیشن نے فتویٰ نافذ کیا کہ یہ کتابِ مقدس کے خلاف ہے اور اس بناء پر کوپرنیکس مرتد اور کافر ہے۔

گلیلیو نے جو دوربین کا موجد گزرا ہے۔ ایک کتاب کوپرنیکس کی حمایت میں لکھی جس میں ثابت کیا کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے اس پر مجلس "انکویزیشن" نے فتویٰ دیا۔ کہ وہ مستوجب سزا ہے۔ چنانچہ اس کو گھٹنوں کے بل کھڑا کر دیا۔ اور یہ حکم دیا گیا۔ کہ وہ اس مسئلہ سے انکار کرے لیکن جب وہ اپنے عقیدہ پر ثابت قدم رہا۔ تو قید خانہ بھیج دیا گیا اور دس سال محبوس رہا کولمبس نے جب کسی نئے جزیرے کے دریافت کرنے کی امید پر سفر کرنا چاہا۔ تو کلیسا نے فتویٰ دیا کہ اس قسم کا ارادہ مذہب کے خلاف ہے۔

زمین کے کروی ہونے کا خیال جب اول ظاہر کیا گیا۔ تو پادریوں نے سخت مخالفت کی۔ کہ یہ اعتقاد کتاب مقدس کے خلاف ہے۔

غرض ہر قسم کے علمی ایجادات اور اکتشافات پر پادریوں نے کفر و الحاد کے الزام لگائے تاہم چونکہ علمی ترقی کا اٹھان تھا۔ ان کی کوششیں بیکار گئیں۔ اور علوم و فنون تکفیر ہی کے سائے میں پھولے اور پھلے۔

پادریوں کے تعصبات اور وہم پرستی اگرچہ علم کو دبا نہ سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمی گروہ نے پادریوں ہی کے خیالات اور اوہام کو مذہب سمجھا۔ اور اس بنا پر نہایت مضبوطی سے ان کی رائے قائم ہو گئی۔ کہ مذہب جس چیز کا نام ہے۔ وہ علم اور حقیقت کے خلاف ہے۔ یہی ابتدائی خیال ہے جس کی آواز بازگشت آج تک یورپ میں گونج رہی ہے۔ بے شبہ اگر مذہب اسی چیز کا نام ہے۔ تو سائنس کے مقابلے میں کسی طرح نہیں ٹھہر سکتا۔ لیکن اسلام نے پہلے دن کہہ دیا تھا۔ کہ انتم اعلم بامور دنیاکم۔ یعنی تم لوگ دنیا کی باتیں خود خوب جانتے ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ سائنس اور تمام علوم جدیدہ اسی دنیا سے متعلق ہیں معاد اور آخرت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں۔

اس موقعہ پر یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ اسلام میں سیکڑوں فرقے پیدا ہوئے۔ اور ان میں اس قدر اختلاف رہا۔ کہ ایک نے دوسرے کی تکفیر کی یہ تکفیر بڑے بڑے مسائل پر محدود نہ تھی۔ بلکہ نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو اسلام کے دائرہ سے خارج کر دیتا تھا یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن علمی تحقیقات اور اکتشافات کی بناء پر کبھی کسی شخص کی تکفیر نہیں کی گئی قدمائے مفسرین کا خیال تھا۔ کہ پانی آسمان سے آتا ہے۔ یعنی آسمان پر ایک دریا ہے بادل اس سے پانی لیتے ہیں۔ اور برساتے ہیں۔ آفتاب پانی کے ایک چشمہ میں غروب ہوتا ہے۔ زمین مسطح ہے۔ کروی نہیں۔ ستارے جو ٹوٹتے ہیں، شیاطین کے شعلہ ہائے آتشیں ہیں مفسرین ان تمام باتوں کو قرآن کے نصوص سے ثابت سمجھتے تھے۔ چنانچہ امام رازی نے مفسرین قدیم کے یہ تمام اقوال تفسیر کبیر میں نقل کئے ہیں۔ لیکن جب عباسیوں کا علمی دور آیا اور فلسفہ اور طبیعات نے ترقی کی۔ تو لوگوں نے ان خیالات کی مخالفت کی۔ باوجود اس کے خود مفسرین کے گروہ میں سے ایک شخص نے بھی ان لوگوں کو کافر اور منکر قرآن نہیں کہا معتزلہ کو محدثین اس بنا پر کافر کہتے ہیں۔ کہ وہ قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں۔ لیکن اس بنا پر کوئی ان کو کافر نہیں کہتا۔ کہ وہ جادو کی حقیقت سے منکر ہیں۔ غرض جس حد تک تحقیق و تفتیش کی جائے عموماً یہ ثابت ہوگا کہ مسلمانوں نے علمی تحقیقات اور ایجادات کو کبھی مذہب کا حریف مقابل نہیں سمجھا۔ بلکہ محققین نے صاف تشریح کر دی۔ کہ اسباب کائنات اور مسائل ہیئت وغیرہ نبوت کی سرحد سے بالکل الگ ہیں۔ اور انبیاء کو تہذیب اخلاق کے سوا اور کسی چیز سے غرض نہیں۔"

موازنۂ انیس و دبیر

یہ بھی حیدرآباد میں لکھی گئی۔ اور "سلسلۂ آصفیہ" میں شامل ہوئی، علامہ شبلی نے جتنی کتابیں لکھیں عرب و ایران کی تاریخ۔ مشاہیر اور علم و ادب کے متعلق لکھیں۔ صرف یہ "موازنہ" ہندوستان اور اردو زبان سے متعلق ہے۔ بنابریں "علمائے کلام" اور "شعرائے عجم" کے درمیان میں "انیس و دبیر" کے آجانے کا کوئی قرینہ نہ تھا لیکن حسن اتفاق سے اس زمانے میں علامہ شبلی حیدرآباد میں مقیم تھے۔ وہاں تعزیہ داری اور مرثیہ خوانی کا ہمیشہ سے بڑا اہتمام تھا۔ علامہ کے دوران قیام میں لکھنؤ کے مشاہیر مرثیہ، مرزا اوج، خلف مرزا دبیر، میر نفیس، عارف، رشید، حیدرآباد آئے۔ بڑی دھوم کی مجلسیں ہوئیں بڑے زور کے مرثیے پڑھے گئے۔ ان کو دیکھ کر اور سن کر علامہ شبلی کو بھی "موازنہ انیس و دبیر" کا خیال آیا لیکن اس طرح کی تصنیف کی تجویز بہت پہلے سے ان کے ذہن میں تھی۔ "موازنہ" کے ساتھ ساتھ ایک اور کتاب لکھی گئی ہے۔ جو بعد کو شائع ہوئی۔ یعنی مولوی امجد علی اشہری کی "حیات انیس" اشہری صاحب اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں جس سال مدرسۃ العلوم علیگڑھ کے مشہور بانی سر سید احمد خاں بہادر کا انتقال ہوا راقم کو نواب محسن الملک بہادر کی خدمت میں علیگڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ جو سرسید کی کوٹھی میں فروکش تھے اس کوٹھی کے عالی شان کمرے میں سرسید کا کتب خانہ علامہ شبلی صاحب نعمانی کے سپرد تھا۔ میں اکثر جی بہلانے کو وہاں جا بیٹھتا۔ ایک روز علامہ شبلی نے مجھ سے کہا کہ اردو میں میر انیس کا درجہ ایسا ہے جیسے فارسی میں فردوسی کا درجہ ہے۔ مگر تعجب ہے کہ ان کے حالات زندگی پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اگر تم سے ہو سکے۔ تو یہ کام کرنے کا ہے۔ میں بھی کچھ مدد دوں گا۔

(دیباچہ حیات انیس صفحہ ۱-۲)

اشہری صاحب نے اپنی تالیف کے متعلق ایک طویل نظم لکھ کر رسالہ "مخزن" لاہور میں چھپوائی تھی جس میں میر انیس کے جاننے والوں سے کتاب کے لئے مواد مہیا کرنے کی درخواست کی تھی۔ اس نظم میں بھی علامہ شبلی کی فرمائش کا حوالہ دیا جائے۔

کہا یہ مجھ سے مکرر جناب شبلی نے
کہ میں انیس کی لائف لکھوں برسم کبار

اس کے بعد اشہری صاحب لکھتے ہیں۔

"اس پر بھی بجز وعدۂ فرصت کسی صاحب نے کچھ نہ لکھا
مولانا شبلی صاحب نے کچھ مدد دینے کا وعدہ کیا تھا وہ
خود موازنہ "انیس و دبیر" لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب شبلی علیگڑھ سے مستعفی ہو کر حیدرآباد آگئے تھے یہاں انہوں نے بجائے اشہری صاحب کو مدد دینے کے خود "موازنہ" لکھنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اور اس میں شک نہیں۔ کہ اردو اور مرثیہ دونوں کی خوش قسمتی تھی۔ کہ علامہ کو اس طرف توجہ ہوئی۔ ان کے ذہن رسا اور دقت نظر نے کلام انیس کا جیسا تجزیہ و تبصرہ کیا ہے جو نکتے نکالے ہیں۔ جو موازنے کئے ہیں۔ وہ دوسرے سے مشکل تھے۔ اشہری صاحب نے اپنی "حیات انیس" پہلے لکھنی شروع کر دی تھی اور "موازنہ" کے شائع ہونے سے پہلے تقریباً مکمل کر چکے تھے، لیکن "حیات" سے پہلے "موازنہ" چھپ گیا۔ تو اشہری صاحب نے جہاں مولانا حالی، علامہ آزاد، مولوی امداد امام اثر کی رائیں کلام انیس کے متعلق لکھیں۔ علامہ شبلی کی رائے پیش کرنے کے لئے "موازنہ" سے بھی بارہ صفحے نقل کئے۔ ان صفحات میں علامہ شبلی کے وہ فقرے بھی ہیں، جن میں مرزا دبیر کے متعلق لکھا ہے کہ فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی۔ بلاغت نام کو نہیں اس پر اشہری صاحب نے یہ نوٹ لکھا ہے۔

"میر انیس اور مرزا دبیر کے مقابلہ کی بحث ان چند سطروں پر تمام نہیں ہو سکتی اس کے لئے دونوں صاحبوں کے [illegible] پر نظر کرنا اور بات بات کو ایک دوسرے کے مقابل دیکھنا اور دکھانا ہوگا؟"

یہ بحث اعتراضات کے سلسلے میں پہلے آچکی ہے۔ "موازنہ" کی خوبیوں کے مقابلے میں ان چند

اعتراضات کی کوئی حقیقت نہیں علامہ شبلی کی یہ تصنیف بھی اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی اور بہترین ہے۔ دو ایک نمونے یہ ہیں۔

"الف :۔ فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکہ یہ ہوتا ہے۔ کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں۔ کہ لفظ سادہ آسان کثیر الاستعمال ہو۔ اس لئے لوگ مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ ان دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے۔ مرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں اکثر ان کے کلام میں مبتذل الفاظ آجاتے ہیں۔

• مثلاً جہاں حضرت شہربانو نے حضرت عباس کی لاش پر نوحہ کیا ہے۔ شہربانو کی زبان سے فرماتے ہیں۔

"ہے ہے میرے دیور، میرے دیور۔ میرے دیور"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

" ناشتہ تو ان کی سالگرہ کا نکال لا"

ابتذال کی صاف اور بین مثال نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے۔ اگر یہ ممیز نہ ہو۔ تو سادگی اور صفائی میں نظیر کا کلام میر انیس یا میر تقی سے ٹکر کھاتا۔

ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں، کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں وہ مبتذل ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں، سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں۔ لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا ابتذال کا معیار مذاق صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ مذاق صحیح خود بتا دیتا ہے۔ کہ یہ لفظ مبتذل پست اور سوقیانہ ہے۔

میر صاحب کو اگرچہ واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ہر قسم کے جزئی جزئی واقعات اور حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ ان کی انتہا درجے کی قادر الکلامی ہے کہ پھر بھی ان کی شاعری کے دامن پہ ابتذال کا دھبہ نہیں آنے پاتا۔

کلام کی فصاحت

یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی لیکن کلام کی فصاحت میں صرف الفاظ فصیح ہونا کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضرور ہے، کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئیں، اُن کی ساخت ہیئت، نشست، سبکی، اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ قرآن مجید میں ہے۔ "مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأیٰ" فواد اور قلب ہم معنی الفاظ ہیں، اور دونوں فصیح ہیں۔ لیکن اگر اس آیت میں فواد کی جگہ قلب کا لفظ آئے۔ تو خود یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ گو "قلب" کا لفظ بجائے خود فصیح ہے لیکن مابعد اور ماقبل کے جو الفاظ ہیں ان کی آواز کا تناسب "قلب" کے لفظ کے ساتھ نہیں ہے۔

میر انیس کا مصرعہ ہے۔

"فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور"

صحرا اور جنگل ہم معنی ہیں، اور دونوں فصیح ہیں، میر انیس نے جا بجا ان دونوں لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ اور ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کیا ہے۔ لیکن اگر اس مصرعہ میں "صحرا" کے بجائے "جنگل" کا لفظ استعمال کیا جائے۔ تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔

میر صاحب کا ایک شعر ہے۔

طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں!

یہاں جنگل کے بجائے صحرا لاؤ تو مصرعہ پھسپھسا ہو جاتا ہے۔ شبنم اور اوس ہم معنی ہیں اور برابر درجے کے فصیح ہیں، لیکن میر صاحب کے اس شعر میں

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کی بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے۔ تو فصاحت خاک میں مل جائے گی۔۔ لیکن یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے اس مصرعہ میں

شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

شبنم کے بجائے لاؤ تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔۔ اس میں نکتہ یہ ہے۔ کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے اس لئے یہ ضرور ہے۔ کہ جن الفاظ کے سلسلے میں وہ ترکیب دیا جائے۔ ان آوازوں سے اس کو خاص تناسب بھی ہو۔ ورنہ گویا دو مخالف سُروں کو ترکیب دینا ہوگا۔ نغمہ اور راگ مفرد آوازوں یا سروں کا نام ہے۔ ہر سر بجائے خود دلکش اور دلآویز ہے۔ لیکن اگر دو مخالف سُروں کو باہم ترکیب دیا جائے۔ تو دونوں مکروہ ہو جائیں گے۔ راگ کے دلکش اور مؤثر ہونے کا گر یہی ہے۔ کہ جن سُروں سے اُس کی ترکیب ہو، اُن میں نہایت تناسب اور توازن ہو۔ الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صوت اور سُر ہیں۔ اس لئے ان کی لطافت، شیرینی اور روانی اسی وقت قائم رہتی ہے۔ جب گرد و پیش کے الفاظ بھی لئے ہیں ان کے مناسب ہوں۔

کتاب کے آخر میں انیس و دبیر کے متحد المضمون اشعار کا موازنہ کرتے ہیں اس کی مثال یہ ہے۔

الف:۔ دبیر:

دہشت سے جوان بھاگتے تھے، تیر کے مانند
تھا نیزوں کو رعشہ قدم پیر کے مانند

انیس :۔

چلنے میں نیزے کانپتے تھے مثل پائے پیر

میر صاحب کا مصرعہ زیادہ فصیح اور صاف ہے ان الفاظ سے کانپتے تھے، جو تصویر خیال میں کھنچ جاتی ہے۔ وہ رعشہ کے لفظ سے پیدا نہیں ہوتی سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک چلنے کی قید نہ مذکور ہو۔ پوری تشبیہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ بڈھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی میں کانپتے ہیں۔ اس کے ساتھ چونکہ چلنے کا اطلاق پاؤں اور نیزہ دونوں پر ہوتا ہے۔ اس لئے یہ لفظ اس موقع پر نہایت موزوں ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ نیزہ چلانے کی حالت میں نیزہ کو لچک ہوتی ہے اس لئے اس کو کانپنے سے تعبیر کر سکتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ کہنا کہ نیزہ چلنے کی حالت میں خوف سے کانپتا تھا، نہایت لطیف حسن تعلیل ہے بخلاف اس کے مرزا صاحب نے چونکہ نیزہ کی جنبش اور حرکت کا ذکر نہیں کیا، اس لئے رعشہ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

دبیر :۔ چلائے ہات مل کے جلاجل کہ الاماں

انیس :۔ ہو گیا جوڑ کے ہاتوں کو جلاجل خاموش

جلاجل کے دونوں حصے جو ہلانے میں مل جاتے ہیں، اس کی تعبیر دونوں بزرگوں نے دو طرح پر کی ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ جلاجل چلا کر الاماں کہتا تھا، اور ہاتھ ملتا تھا۔ لیکن چلانے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے گو تشبیہ صحیح ہے۔ لیکن ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ میر صاحب کہتے ہیں کہ حضرت امام حسین کا رعب اس قدر غالب ہوا، کہ جلاجل ہاتھ جوڑ کے چپ ہو گیا۔ رعب اور خوف کی حالت میں ہاتھ جوڑنا اکثر ہوتا ہے۔ اور چونکہ جلاجل کے دونوں حصے جب مل جاتے ہیں۔ تو پھر جب تک جدا نہ ہوں، آواز نہیں دے سکتے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔ کہ وہ ہاتھ جوڑ کر چپ ہو گیا۔

مکاتیب شبلی

سرسید احمد خان کے نام

(از قسطنطنیہ)

سیّدی!

تسلیم! میں ۲۲ مئی کو یہاں پہنچا، لیکن تعلقات کی وجہ سے خط لکھنے کی مہلت نہ مل سکی۔ یہ خط بھی مختصر اور پرائیویٹ [illegible] لکھ رہا ہوں آپ انتخاب فرما کر چھاپ دیں، تو ممکن ہے۔ میں نے سر دست ایک [illegible] روپے مہینہ کرایہ کا لے لیا ہے لیکن کھانے کا خرچ یہاں بہت زیادہ ہے سب ضروریات [illegible]

سو یا اس سے زیادہ روپے بھیج دیں کہ جو کتاب جس وقت ہاتھ آئے لے لی جائے یا نقل و کتابت کا انتظام کیا جا سکے۔ کتابیں یہاں بہت ہیں۔ اور نادر ہیں۔ لیکن کہاں تک کھائی جا سکتی ہیں امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں، اور بوعلی سینا کی تو شاید کل تصنیفات مل سکتی ہیں۔ امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں۔ خیر جو ممکن ہو گا کیا جائے گا۔ یہاں اکثر لوگوں سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ لیکن مشکل زبان کی ہے۔ بعض بڑے کالج دیکھے، مگر زبان کی اجنبیت کی وجہ سے حالات معلوم کرنے میں نہایت دقت ہوتی ہے۔ میں نے ترکی پڑھنی شروع کی ہے اور انشاء اللہ کچھ نہ کچھ بقدرِ ضرورت واپسی کے وقت تک سیکھ لوں گا، اس وقت تمام کالجوں وغیرہ کی رپورٹ تیار کر سکوں گا۔

حالات دل چسپ ہیں۔ اور سفرنامہ کے لئے بہت سامان مل جائے گا۔ لیکن اس وقت بلکہ زمانہ قیام تک مطلق فرصت نہیں مل سکتی۔ ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دور دور واقع ہیں۔ روپیہ بھیجنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کک کمپنی کے ہاں سے نوٹ منگوا کر میرے یہاں رجسٹرڈ بھیج دیجئے۔ میں بھی کک کے نوٹ ساتھ لایا ہوں، اور یہاں کک کے کارخانے میں بے تکلف چل سکتے ہیں۔

یہاں آج کل عینی کی شرح بخاری چھپ رہی ہے۔ ۹ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ بہت بڑی کتاب ہے۔ حنفیوں کو اس کی تلاش تھی۔ وہاں کسی متصلب حنفی کو درکار ہو۔ تو منگوا سکتے ہیں۔ بیروت کے علماء نے تمام نصاریٰ عرب خواہ جاہلیت کے ہوں خواہ اسلام کے۔ ان سب کے اشعار کا ایک مجموعہ تیار کر کے چھاپنا شروع کیا ہے، ایک جلد چھپ چکی ہے۔ اسی میں اخطل کا دیوان بھی ہے لیکن وہ مستقل تین جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ یہ آج تک کہیں نہیں مل سکا تھا۔ یورپ میں بھی اس کی تلاش تھی۔

معتزلہ کی کتابیں یہاں بھی نہیں ہیں۔

وہاں کے حالات جس قدر تحریر فرمایئے گا۔ میری تسکین کا باعث ہو گا۔ لڑکوں کو میں حضور کے بھروسہ پر چھوڑ آیا ہوں۔ میاں حمید کو نگرانی کی تاکید فرمایئے گا۔

یہ خط والد قبلہ کو بھیج دیا جائے۔ یا اس کی نقل۔ متعدد خطوط لکھنے کی فرصت نہیں ہے حالات سفر میں ایک قصیدہ موزوں ہو گیا ہے۔ وہ خط کے ساتھ شامل ہے۔ مطبع مفید عام میں چھاپ کر علی گڑھ گزٹ کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔ تو مناسب ہو گا۔ اس کی چند کاپیاں قبلہ والد صاحب کو بھی بھیج دیجیے گا۔

یہاں کا اخبار اختر جو فارسی زبان میں ہے اور جس کی اشاعت دو ہزار ہے۔ میں نے آپ کے نام روانہ کرنے کے لئے کہہ دیا ہے۔ اس کی ششماہی قیمت چھ روپے ہے۔ وہ ابھی پیکٹ کے ساتھ بھیج دیجیے گا۔ ممکن ہے کہ اس اخبار میں ہمارے کالج کے حالات چھپتے رہیں اور ضرور کچھ نہ کچھ فائدہ دیں گے۔ یہاں اکثر لوگ ہندوستان کے نام سے بھی واقف نہیں۔ ورنہ اگر مسلمانوں کے تمام حالات اور ضرورتیں معلوم ہوں۔ تو کالج کو مدد ملنا یقیناً مشکل نہیں، ہزاروں میل تک یہاں کے اوقات کا فائدہ پہنچتا ہے۔

شبلی نعمانی

۲۴ مئی سنہ ۱۸۹۲ء

قسطنطنیہ ۔ مقام تختہ خان ۔ قریب خان محمود پاشا

سیدی و مولائی!

یہ تیسرا خط ہے۔ جو استنبول سے لکھ رہا ہوں۔ آپ کو اور بزرگانِ وطن کو میرے خطوط کا انتظار نہ کرنا چاہیے۔ یعنی سکوت کی حالت میں قیاس بلکہ یقین کر لیجیے۔ کہ میں بخیریت ہوں۔ باقی حالاتِ سفر۔ اس کی نسبت میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ کہ یہاں سے کچھ نہ لکھوں گا۔

قلمی کتابیں یہاں نہیں ملیں۔ مصر میں کبھی کبھی ہاتھ آ جاتی ہیں اس لئے صرف مطبوع کتابیں خریدی جا سکتی ہیں، لیکن ان کی تعداد بھی معتد بہ ہے۔ یہاں امام غزالی کی تمام کتابیں اور رسالے موجود ہیں، مکاتبات کا نسخہ بھی ہے۔ بوعلی سینا کی اس قدر تصنیفات ہیں۔ کہ کہیں نہ ہوں گی ارسطو وغیرہ کی کتابوں کے اصل ترجمے نہایت قدیم خط میں موجود ہیں۔ لیکن کیا حاصل! کتابت کی شرح چار روپے جزء سے کسی حال میں کم نہیں۔ معتزلہ کی کتابیں البتہ ناپید ہیں۔ عبدالقادر جرجانی کی تفسیر ہے۔ مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں۔

پرسوں میں عثمان پاشا سے ملا۔ نہایت اخلاق سے ملے۔ عربی سمجھ لیتے ہیں۔ اور دو چار معمولی باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے ان کے ہاتھ کا بوسہ دینا چاہا۔ لیکن راضی نہ ہوئے بلکہ الٹی خود میری تقلید کرنی چاہی۔ رخصت کے وقت فرمایا۔ کہ آپ جب چاہیں۔ تشریف لائیں۔ بہت خوشی سے ملوں گا۔ تمام اور بڑے بڑے پاشاؤں سے بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔ لیکن اوّل تو زبان کی اجنبیت ثانیاً مجھ کو اور کسی کی ملاقات کا شوق بھی نہیں۔ یہاں کا ٹائپ بے انتہا عمدہ ہے تمام دنیا میں اس کا نظیر نہیں۔ علیگڑھ گزٹ کے لئے یا مستقل مطبع کے لئے ضرور خریدنا چاہیے۔ بیروت و ہالینڈ کے حروف میں بھی یہ لوچ لچک نہیں۔ افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا اس میں یورپ کا ذرہ پرتو نہیں۔ جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے۔ لیکن دونوں کے حدود جدا رکھی گئی ہیں۔ اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے۔ اصلی ترقی نہ ہو سکے گی۔ یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے جس کا رونا ہے۔

میں نے کالج کا نتیجہ اکمل الاخبار میں دیکھا۔ اور بے انتہا خوش ہوا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اسی عالم میں خط لکھنے بیٹھ گیا ورنہ معمولی باتیں روز روز کیا لکھوں۔

روپے فوراً جس قدر کتاب کے لئے بھیجنے ہوں، بھیجیے۔ یہاں سے میں اٹھا۔ تو پھر مجھ کو خطوط وغیرہ کوئی چیز نہ مل سکے گی۔ یہاں کی جو چیزیں مشہور ہیں۔ وہ آپ کو معلوم ہیں۔ کوئی چیز مطلوب ہو۔ تو تحریر فرمایئے۔ کہ میں لیتا آؤں۔ میں چاہتا ہوں کہ کالج کے لئے چند ترکی زبان کی عمدہ کتابیں خریدی جائیں۔ جن سے یہاں کی ترقی کا اندازہ ہو سکے گا۔

یہ خط والد قبلہ کے پاس بھیج دیا جائے۔ میاں حمید کو تاکید فرمایئے کہ مجھ کو نہایت مفصل خط لکھیں۔ اور عزیزوں کے امتحانات کے نتیجے بھی لکھیں۔

میری تصنیفات تیار ہو جائیں۔ تو چند نسخے یہاں کے لئے چاہئیں۔ لیکن دیر ہو گی۔ تو مجھ کو نہ مل سکیں گی۔ میں انشاء اللہ ۱۵ اگست تک یہاں رہوں گا۔

ہاں آج میں حسین حبیب آفندی سے جو بمبئی میں سفیر تھے اور اب یہاں پولیس جنرل ہیں۔ ملا۔ بے انتہا مہربانی کی گھر کے تمام کمرے دکھائے۔ دعوت کی۔ اور بہت سی مہربانیاں کیں۔ وہ اردو بخوبی بولتے ہیں۔ آپ فوراً سیرۃ النعمان کا ایک نسخہ جو میں وہاں دیکھ آیا ہوں۔ اور اس پر کالج کی مہر نہیں لگی ہے، بھیج دیجیے۔ ضرور میں ان کو ہدیہ دوں گا۔ وہ اسی مذاق کے آدمی ہیں۔

والسلام

۱۵ / جون ۱۸۹۲ء شبلی قسطنطنیہ

باب عالی ۔ ادارہ اختر

نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خان مرحوم کے نام

جناب من۔

آپ کا خط پڑھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ آپ لوگ مجھ کو اس قدر بھولا اور سادہ دل سمجھتے ہیں۔ انگوں کے لئے میرا یہاں رہنا مفید ہوتا۔ تو کیا رہ جاتا۔ لیکن یہاں کا مدینہ ہمیشہ خوشنما لگتا ہے۔ باہر نہیں جاتا۔ مجھ کو سر دست سو روپے ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے۔

اور یہی یہاں کا خرچ ہے۔ پھر جس قدر تنخواہ بڑھتی ہے خرچ بڑھتا جاتا ہے۔ البتہ اگر یہاں کی سوسائٹی میں بہ تذلل، بدحیثیت، بے وقعت ہو کر رہوں، تو بس اندازہ ہو سکتا ہے۔ باقی وہاں کے لئے یہاں کے لوگوں سے چندہ یہ کس قدر حماقت کا خیال ہے۔

مولوی صاحب روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں، میں کچھ ابراہیم ادہم اور بایزید نہیں ہوں میرا تو سارا دنیا کی خواہشوں سے بگڑا ہے، لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے جوڑ توڑ، سازش، دربارداری، خوشامد، لوگوں کی جی حضوری اور بھگت نہیں ہو سکتی اور نہ اس کے کامیابی معلوم

اس لئے میں نے گوشۂ عافیت پسند کیا۔

یہاں مجھ سے میری خواہش کا استفسار ہوا۔ میں نے کہا، موجودہ آمدنی کے ساتھ کالج کے تعلق سے آزادی، چنانچہ اس قدر ماہوار کا منصب مقرر ہو گیا۔ الفاروق کے بعد غالباً ۱۵۰ یا ۲۰۰ ہو جائے۔ روبکار میں اضافہ کا وعدہ درج کر دیا گیا ہے۔ گو مقدار کی تعین نہیں۔ بس میری تنہا زندگی کو یہ بہت ہے۔ تاہل کا ارادہ نہیں، زیادہ دھوم دھام کی خواہش نہیں۔ بے زحمت خدا نے اس قدر دیا تو لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اور یوں تو ع کاسۂ چشم حریصاں الخ رہا قوم کی خدمت کرنی، اس کی تدبیر یہ نہیں۔ کہ جھوٹی سفارش کر کے دو چار کو نوکری دلا دی جائے ان کو اس قابل بنانا چاہیے کہ وہ خود اپنی سفارش کر سکیں

زیادہ نیاز۔ شبلی نعمانی
۱۵ر ستمبر ۱۸۹۸ء

شیخ حبیب اللہ صاحب کے نام

(شیخ حبیب اللہ مولانا کے والد تھے)

قبلہ ام۔ تسلیم!

گو میرا قلم خامہ نقاش کی ہمسری کرے جس سے میں اس عجیب و غریب مقام (نینی تال) کی پوری تصویر کھینچ سکوں۔ تاہم مجھ کو یہ امید نہیں کہ اس کوشش سے عزیزان وطن کو جو میرے خط پر آنکھ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ اپنے شوق و انتظار کا صلہ مل جائے گا۔

میں بے تکلف تسلیم کرتا ہوں۔ کہ نینی تال ایک عجیب اور "حیرت انگیز" مقام ہے۔ لیکن اگر "تعجب انگیز" اور دلچسپ و فرحت افزا ہونا دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ تو مجھ ایسے ایشیائی خیال کے آدمی سے یہ امید رکھنا عبث ہے۔ کہ میں اس کو "فرحت زا" بھی مان لوں گا۔ ہاں جو لوگ انگریزوں کی ہر ادا پر جان دیتے ہیں۔ ان کا مذہب کیا پوچھنا!

ہر چہ آید در دلم غیر تو نیست

اب حالات سنیئے:۔

کاٹ گودام تک ریل ختم ہوتی ہے۔ اور پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کاٹ گودام سے نینی تال ۱۲ میل ہے۔ مگر تمام راستہ قدرت الٰہی کی نیرنگی و عظمت کا مرقع ہے۔ عرض میں پانچ چھ ہاتھ زمین چھوڑی ہوئی ہے جس پر راستہ چلتا ہے۔ باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے جس کی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے، دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے۔ اور اگر اس پہاڑ میں سخت سردی نہ ہوتی۔ تو یہ غار بڑے بڑے اژدہا اور موذی جانوروں کے دارالسلطنت ہوتے نینی تال جب تین میل رہ جاتا ہے۔ تو پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ نیچے زمین سے اس مقام کا ارتفاع تین میل سے کم نہیں۔ مگر اس پیچ و پیچ سے راہ نکالی ہے کہ بے اختیار انگریزوں کی ہمت پر آفرین کی صدا بلند ہوتی ہے۔ آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ جو کرشا تین میل کا اونچا ہو گا۔ اس کے زینے کیسے پُرپیچ اور دشوار گذار ہوں گے۔ کوئی شخص کیسا ہی بے حس یا مستقل دل رکھتا ہو۔ یہاں پہنچ کر ممکن نہیں۔ کہ حیرت کے صدمہ سے بچ سکے۔ تال جو ایک میل سے زیادہ لمبا ہے۔ یہ ایک نہایت گہرا غار تھا، جس کی تھاہ اب بھی غیر معلوم ہے اس میں مدت سے قدرتی چشموں کا پانی گرتا رہتا ہے۔ اور اب وہ بھر گیا ہے اور تال کے لقب سے ممتاز ہے۔ شام کو اس کے کنارے میموں اور مسوں کا مجمع ہوتا ہے، اور مختلف طرح کے کھیل کھیلتی ہیں، سامنے ایک میدان ہے جس میں انگریز کرکٹ کھیلتے ہیں، یہ سب کچھ ہے مگر چونکہ اس کے دونوں طرف پہاڑ کی نہایت اونچی دیواریں کھڑی ہیں۔ مجھ کو یہ جگہ ہر طرف سے نہایت بند اور گھٹی ہوئی معلوم ہوئی۔ مجھ کو یقین ہے کہ جو شخص صحرائیت اور فضائیت کا دلدادہ ہے میرے دعویٰ کی شہادت پر فوراً آمادہ ہو گا۔ جس کوٹھی میں میں ہوں۔ بہت بلندی پر نہیں ہے تاہم دو دن کی مشق میں نیچے تک پہنچنے اور واپس آنے میں میرا دم ٹوٹ جاتا ہے، اور کئی جگہ ٹھہرنا پڑتا ہے۔ ہر ایک کوٹھی سے انگریزوں کی بے روک ہمت اور پُرجوش محنت کی شہادت ملتی ہے، یہاں جو کچھ آرام ہے۔ صرف یہ ہے کہ کسی وقت یہاں آفتاب کی عمل داری نہیں ہونے پاتی، یہی بات ہے۔ جس کے لئے انگریزوں نے لاکھوں کروڑوں روپے صرف کر دیئے ہیں۔ در حقیقت ہم کو انگریزوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔ کہ صحت سب چیزوں پر مقدم ہے۔ اور کوئی کام دنیا میں ناممکن نہیں۔ رمضان تو خوب گذرے گا۔ مجھ کو اگر کچھ دلچسپی ہے۔ تو اسی سے۔ جس کوٹھی میں میں ہوں۔ سید صاحب کے حقیقی بھتیجے بھی مع اہل و عیال کے تشریف فرما ہیں۔ اور مجھ کو بھی مشکل سے جگہ ملی۔ یقیناً اگر میاں محمد آتے، تو نہایت تکلیف اور سید صاحب پر بار ہوتا۔ تحریر فرمایئے۔ کہ مدرسہ کے لئے کیا ہوا، منشی جی نے رقعہ لکھایا نہیں۔ میرا خط محمد سمیع کو عنایت ہو۔ تاکہ تمام لوگ یہاں کے حالات سے مطلع ہو سکیں۔ میرا پتہ یہ ہے۔

نینی تال کوٹھی نمبر ۱۶۰
ایڈرونیسٹو ایلہ پاٹا فرودگاہ۔ سید احمد خان
شبلی نعمانی

۲۵ر مئی ۱۸۸۷ء

از قسطنطنیہ

قبلہ ام۔ تسلیم:۔

میں بفضلہ اچھا ہوں، اب میں ایک دوسرے مکان میں اٹھ آیا ہوں۔ جو نہایت خوش منظر اور تمام ضروریات کا جامع ہے۔ کرایہ زیادہ تھا۔ مگر بغیر اس کے چارہ نہ تھا، یہاں کے حالات خط میں نہیں سما سکتے۔ اس لئے اس کو مصر سے موقوف رکھتا ہوں۔ افسوس ہے کہ یہاں بجز ترکی زبان کے کسی اور زبان کا رواج نہیں ہے۔ تمام چیزوں میں وقت پیش آتی ہے اور اکابر کی ملاقات تو بالکل بے معنی ہوتی ہے۔ نہ وہ میری سمجھتے ہیں نہ میں ان کی۔

کتابیں یہاں عجائب و غرائب ہیں۔ لیکن حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں نہ نقل ہو سکتی ہے نہ حافظہ ان کے لئے کافی ہے۔ میں ہر روز دو تین میل پیادہ سیر کرتا ہوں۔ کیونکہ کتب خانے دور دور واقع ہیں۔ یہ سیر صحت کے لئے بہت مفید ہے۔ ترکی پڑھنی میں نے شروع کی تو ہے دیکھئے پوری بھی کر سکتا ہوں یا نہیں۔ یہاں بعض بعض ہندوستانی بھی ہیں اور سرکاری عہدوں پر مامور ہیں۔ لیکن تنخواہیں کم ہیں۔ یہاں تنخواہیں عموماً کم ہوتی ہیں چونکہ میں زیادہ قیام کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے خط بھیجنے میں مطلق تاخیر نہ ہونا چاہیے ورنہ مجھ کو نہیں مل سکے گا۔ ۲۰/۲۲ دن میں خط پہنچتا ہے۔

ماموں صاحب سے فرما دیجیے کہ آج کل یہاں عینی بخاری کی شرح چھپ رہی ہے۔ نو جلدیں چھپ چکیں، نہایت عمدہ چھپ رہی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ بعض تحقیقات اس میں

ایسی ہیں۔ جو ختم ابھاری میں نہیں مل سکتیں۔ قیمت ابھی متعین نہیں ہوئی۔ ایک مشترک کمپنی ڈیڑھ دو لاکھ سرمایہ کی ہے۔ جس نے ایک عظیم الشان مطبع قائم کیا ہے۔ اس میں یہ کتاب چھپ رہی ہے۔ اس ملک میں تمام کام انجمن اور کمپنیوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ یہاں کے کالجوں کی ایک بات مجھ کو بہت پسند آئی۔ ہر کالج کا خاص لباس ہے۔ اور کوٹ پر گریباں سے قریب ہر کالج کا نام لکھا ہوتا ہے۔ مجھ کو یہ بات پسند ہوئی۔ ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا۔ سید صاحب قبلہ بغیر کسی پس و پیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں۔ تو بہت اچھا ہے۔

جناب سلطان المعظم ہر جمعہ کو مسجد حمیدیہ میں تشریف لاتے ہیں اور وہ نہایت عمدہ نظارہ ہے کہتے ہیں۔ کہ عید کے دن عجیب سماں ہوتا ہے۔ خدا سے امید ہے۔ کہ میں دیکھ سکوں! میں یہاں دو تین مہینے سے زیادہ ٹھہرنا نہیں چاہتا۔ اس کے بعد انشاء اللہ طرابلس اور دمشق کی سیر کر کے قاہرہ جاؤں گا۔ اور وہاں چند روز قیام کروں گا۔

اگرچہ میری امیدیں مسلمانوں کی ترقی و قوت کی نسبت بالکل برباد ہو گئی ہیں۔ کیونکہ یہاں کی حالت وہاں سے کچھ اچھی نہیں۔ تاہم سفر بے شبہ ضروری تھا۔ جو اثر اس سفر سے میرے دل پر ہوا۔ وہ ہزار کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھ کو معلوم ہوا۔ کہ انسان جب تک دنیا کے بڑے بڑے حصے نہ دیکھے۔ انسان نہیں ہو سکتا۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جن کی تمام عمر ایک مختصر سی چاردیواری میں بسر ہو جاتی ہے۔

میرے نام اس پتہ سے خط بھیجنا چاہیئے۔

قسطنطنیہ ۔ باب عالی
معرفت ادارہ اختر۔

لیکن لفافہ پر انگریزی اور عربی دونوں خط میں ہونا چاہیئے۔ میرے تمام احباب حاضرہ کو سلام و نیاز۔ میاں محمد اسحاق کا نام معلوم نہیں کہ درج امیدواران منصفی ہو گیا یا نہیں۔ جواب خط میں کالج کے نتیجہ امتحان کی تفصیل ضرور ہو۔

یہ خط یا اس کی نقل سید صاحب قبلہ کو بھیج دی جائے۔ جناب موصوف کی خدمت میں عرض ہے کہ علیگڑھ گزٹ میرے نام جاری کر دیں۔

والسلام۔
قسطنطنیہ۔ جامع باب عالی معرفت ادارہ اختر
۱۰ جون ۱۸۹۲ء شبلی نعمانی

قبلہ گاہ!

ایک خط خدمت عالی میں روانہ کر چکا ہوں۔ سید صاحب کو آج کی ڈاک میں ایک خط لکھا ہے۔ وہ بھی آپ کو ملے گا۔

میں حسین آفندی سے جو پہلے سفیر بمبئی تھے۔ اور اب یہاں محکمہ پولیس کے افسر کل ہیں۔ مل کر نہایت خوش ہوا۔ ان کے اخلاق نے مجھ کو نہایت گرانبار کر دیا ہے اور میں کسی قدر سبکدوش ہونا چاہتا ہوں اس لئے عرض ہے۔ کہ نہایت اہتمام نہایت تلاش اور جلد جلد کے ساتھ نظام آباد کے برتن ارسال فرمایئے۔ کسی ہوشیار شخص کو نظام آباد بھیجئے۔ جو وہاں کے کسی رئیس کی معرفت فرمائش بنوا کر لائے۔ یہاں ہندوستان کے ظروف بکتے ہیں۔ مگر اچھے نہیں آتے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو۔ تو لکھنؤ کی چکن کا ایک تھان مگر نہایت عمدہ فردی بوٹیاں ہوں۔ نہایت باریک اور نفیس کام ہو۔ اور تیس سے کم قیمت کا نہ ہو۔ خواجہ عزیز الدین صاحب کی معرفت اگر خرید کیا جائے۔ تو غالباً اچھا ہوگا۔ میں یہاں آخر اگست تک رہوں گا۔ اس وقت تک آ جائے۔ یہ بھی نہ ہو۔ تو مراد آباد کا کوئی برتن مگر نہایت عمدہ۔ غرض کوئی نادر چیز ضرور بھیجئے۔ والتسلیم۔

قسطنطنیہ ۔ ادارہ معارف ۔ باب عالی
"شبلی"
۱۵ جون ۱۸۹۱ء

قبلہ گاہ۔

آج میں نے عجیب دلآویز "خواب" دیکھا ہے۔ "عجیب" اس لئے کہ دوپہر کا وقت تھا۔ اور آنکھیں بیدار تھیں۔ اور "دلآویزی" کی یہ کیفیت ہے۔ کہ جاگے ہوئے مدت ہو چکی ہے۔ اور اب تک آنکھوں میں وہی سماں پھر رہا ہے۔ مفصل سنیئے۔ آج جمعہ کا دن تھا۔ اور معمول کے موافق موکب سلطانی کا نظارہ گاہ تھا۔ میں بھی ہمہ تن شوق بن کر گیا۔ جامع حمیدیہ میں داخل ہوا۔ سلطان المعظم بڑی شان و شوکت سے آئے۔ لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ یہ سیر صرف ان لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے۔ جو گزرگاہ سلطانی پر پہلے سے موجود رہتے ہیں اور پھر نماز کے ختم ہونے تک جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے۔

محل سلطانی سے تھوڑی دور کے فاصلے پر ایک نہایت پر تکلف جامع مسجد ہے۔ جو سلطان کے نام سے حمیدیہ مشہور ہے۔ اس گزرگاہ میں ایک مکان ہے۔ اور وہ دور دور ملکوں سے آئے ہوئے معزز سیاح یا عہدہ دار جو موکب ہمایونی کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کسی معزز شخص کے ذریعے سے اجازت حاصل کرتے ہیں۔ اور اس مکان کی چھت پر بیٹھ کر یہ تماشا دیکھتے ہیں۔ اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔ کیونکہ سواری کے وقت دور دور تک چاروں طرف فوج کا دائرہ ہوتا ہے اور کوئی شخص اس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ حسین حبیب آفندی (سابق سفیر بمبئی) نے مجھ کو اجازت دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اتفاق سے وہ دیر میں آئے۔ ادھر سواری کا وقت قریب آگیا۔ اور طرقوا اور دور باش کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ مجبوراً میں مسجد میں داخل ہوا۔ اور صف اول میں جا کر بیٹھا۔ سلطان کی گاڑی زینہ تک آتی ہے۔ اور وہ اتر کر فوراً مسجد کے بالائی حصہ پر جہاں نہایت مقرب اور مخصوص لوگوں کے سوا کوئی نہیں جا سکتا۔ تشریف لے جاتے ہیں۔ اور وہاں ایک مقصورہ ہے جس کا دروازہ منبر کے بائیں طرف ہے۔ یہ سلطان کی نماز کی جگہ ہے۔ جب سلطان تشریف لاتے ہیں۔ تو اطلسی پردے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ اور کوئی شخص ان کو دیکھ نہیں سکتا۔ خطیب نے جب سلطان کے مقصورہ کی طرف نگاہ اٹھا کر بڑے جوش سے یہ کہا۔ کہ اللہم انصر مولانا السلطان الغازی عبدالحمید خان۔ تو میرے بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور میرے دل کا یہ حال تھا۔ کہ امڈا چلا آتا تھا۔ خطیب نے پہلے صحابہ کا نام پڑھا۔ اور سلطان کا نام آیا۔ تو ایک زینہ اتر آیا۔ تاکہ ظاہر ہو۔ کہ سلطان اگرچہ آج ظل اللہ ہیں۔ تاہم ان کا رتبہ حضرت صدیق و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کچھ نسبت نہیں رکھتا۔ نماز کے بعد حسین حبیب آفندی نے اتفاقاً مجھ کو دیکھ لیا۔ اور مسجد کے صحن میں جہاں پاشا اور سرداران فوج حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اور لوگوں سے کہہ دیا۔ کہ ان سے کوئی تعرض نہ کرے۔ سلطان مقصورہ سے اتر کر زینہ کے قریب پردہ کی اوٹ میں بیٹھے۔ اور فوجیں سامنے سے گزرنی شروع ہوئیں۔ دو گھنٹہ کامل ایک عجیب تماشا نظر آتا رہا۔ تقریباً دس ہزار فوج تھی۔ مختلف رسالے اور ہر رسالے کے تمام ساز و اسلحہ جدا جدا تھے۔ میں کیا کہوں۔ ترکی جوانوں کی دلیرانہ صورتیں۔ چمکتے ہوئے اسلحہ، مسلسل اور باقاعدہ رفتار، گھوڑوں کی جست و خیز، پاشاؤں کا زرکار لباس، جگمگاتے ہوئے تمغے، عجیب سماں تھا۔ جو کسی طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اخیر میں دونوں شہزادے آئے۔ بڑے کی عمر نو دس برس کی ہے۔ لیکن جس شان و شوکت سے وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ بڑے سے بڑے شہسواروں کے تصور نہیں ہو سکتے۔ فوجیں گزر چکیں۔ تو سلطان گاڑی پر سوار ہوئے۔ اور ہمارے سامنے سے گزرے۔ سواری مقابل آئی۔ تو تمام حلقہ نے رکوع کے قریب جھک کر سلام کیا۔ سلطان دونوں ہاتھوں سے

ان کا جواب دیتے تھے۔ یورپ کے اکثر معزز اشخاص یہ تماشہ دیکھنے آئے تھے۔ حالانکہ یہ معمولی چیز ہے اور ہر جمعہ کو ہوتی ہے۔ عید کے دن کہتے ہیں کہ قیامت کا سماں ہوتا ہے۔ خدا وہ دن بھی دکھلائے۔

قسطنطنیہ " شبلی نعمانی
۱۹ جون ۱۸۹۲ء

ماموں کے نام

ماموں صاحب قبلہ۔

لوگوں سے معلوم ہوا کہ آپ کو میری تقریر سے ملال ہوا جس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے میرے مبہم طعن آمیز فقروں کو اپنے اوپر محمول کیا، میری عادت غلط بیانی کی نہیں ہے۔ اگر میں نے ایسا کیا ہوتا، تو میں ہرگز انکار نہ کرتا۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں۔ کہ میرے کسی فقرہ سے آپ مقصود نہ تھے۔ اور نہ حاضرین نے آپ کی طرف اس کا اشارہ سمجھا۔

میں وہیں تک کسی شخص کی نسبت کچھ کہہ سکتا ہوں، جب تک وہ وعدہ یا امید کا سلسلہ قائم رکھتا ہے۔ اور جب کوئی شخص صاف انکار کر دیتا ہے۔ تو اس کی نسبت ایک حرف بھی جلسہ میں نہیں کہتا، بلکہ ایسا کہنا نہایت بد اخلاقی اور بے تمیزی سمجھتا ہوں۔ بھائی سعید مدت سے اسکول کو کچھ نہیں دیتے۔ لیکن میری تقریر میں ایک حرف بھی ان کے متعلق نہ تھا۔ اسی طرح شیخ عبدالحق وغیرہ کے متعلق بہر حال آپ کے متعلق میرا ایک حرف بھی نہ تھا اور نہ لوگوں نے ایسا سمجھا

واللہ علی ما اقول شہید
والتسلیم شبلی
۱۳ر اگست

مسٹر محمد اسحاق صاحب بی/اے/ایل/ایل/بی کے نام

(محمد اسحاق مولانا کے چھوٹے بھائی تھے)

برادر عزیز۔

کانگریس بے خلل اور توقع سے زیادہ کامیاب ہوئی۔ افسوس کہ تم نہیں تھے۔ میں نے تم کو نہیں لکھا، مگر اکبر حسین سے تاکید کی تھی۔ کہ تمام حالات سے تم کو اطلاع دیں گے۔ میرا مضمون علیحدہ چھپ رہا ہے پچاس جز کی ضخامت ہوگی۔ قصیدہ اس مضمون اور روئیداد دونوں کے ساتھ چھپے گا۔

اس وقت ایک نہایت ضروری امر کے لئے لکھتا ہوں۔

مولوی محمد عمر صاحب کا ایک خط خط کے ساتھ ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ اس کا روئے خطاب تم سے بھی اسی قدر ہے، جس قدر مجھ سے۔ تم اپنی پختہ رائے سے جو کامل غور کے بعد قائم کرو، مجھ کو مطلع کرو۔ تم کو خاص ان پہلوؤں پر لحاظ رکھنا چاہیے۔

(۱) نیشنل اسکول کا قائم رکھنا کیوں ضروری ہے؟

(۲) کیا بلحاظ حالات موجودہ اور توقعات آئندہ کے وہ مستقل طور پر قائم رہ سکتا ہے۔

(۳) ہماری قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان جس میں تم بھی ایک بلند پایہ پر ہونے کا حق رکھتے ہو، اس کے کچھ کام آسکیں گے۔

یہ امر بھی لحاظ طلب ہے کہ تم کو بی/اے کے بعد کہاں بیٹھ کر ایم/اے یا قانون کے لئے تیار ہونا چاہئے غالباً اگر تم اعظم گڑھ کو پسند کرو۔ تو اسکول کو خود تقویت ہو گی۔ اعظم گڑھ میں رہ کر تم اگر اپنا ماہانہ صرف والد قبلہ سے وصول کرتے رہو۔ (جس کا ذمہ میں کر سکتا ہوں) تو الہ آباد کے قیام سے یہاں کا قیام مناسب تر ہوگا۔ کیوں کہ تم ان روپیوں کو اپنے خاص مذاق اور علمی کتابوں کے خرید کرنے میں صرف کر سکو گے۔ شاید تم کو معلوم ہوگا۔ کہ میں لوگوں سے تمہاری نسبت کس قدر علمی زندگی بسر کرنے کا تذکرہ کر سکتا ہوں۔

اب اس بات پر خیال کرو۔ کہ یہ اسکول ہم لوگوں کے خیالات اور حوصلوں کا ایک عمدہ شگفتہ ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں۔ کہ ہم اپنی زندگی کی عملی ترقی کے ساتھ اس کو بھی ترقی دیتے جائیں گے۔ آخر وہ کیا چیز ہے، جس کو مخصوص صورت میں ہم ایک قومی کام کہہ سکتے ہیں۔ ہم میں جو لوگ قومی مذاق پیدا کرتے جائیں گے۔ ان کے لئے اپنی قومی فیاضی کے صرف کرنے کا اس اسکول سے عمدہ تر کیا موقع ہوگا۔ بسر دست میرے نزدیک بھی وہ ایک حقیر صورت رکھتا ہے۔ لیکن ایک لوہار کی اس میلی چمڑی سے کم حیثیت نہیں ہے، جس کو اس نے مدت تک اپنے پاؤں کے محفوظ رکھنے کے لئے استعمال کیا تھا۔ اور جو بعد کو ایک معمولی علم پر چڑھ کر تین ہزار برس تک درفش کاویانی کے فخر آمیز لقب سے پکارا گیا۔

خیر جو تمہاری رائے ہو۔ اس سے مطلع کرو۔ اور اس کی نسبت جن امیدوں کا خیال ہو، لکھو۔

والسلام
شبلی نعمانی ۱۴ر جنوری ۱۸۸۸ء

مولوی حکیم محمد عمر صاحب کے نام

(یہ خط علیگڑھ سے زمانہ پروفیسری میں لکھا گیا)

برادرم، اکرم ما، فخر ما، مقتدائے ما!

اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھیے، نہ کوئی اور واقعہ آپ سنئے، اور میں دل سے اٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں۔ یوں تو مدرسۃ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں۔ مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا ہے۔ کہ لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے، جس کو وہ انجمن الصلوٰۃ کہتے ہیں۔ ایک بی/اے سیکرٹری ہے۔ اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں، چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خوان لوگوں کو اس پر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے۔ "الصلوٰۃ خیر من النوم" پانچوں وقت کی نمازیں باجماعت ہوتی ہیں، اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش سے بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں۔ مغرب کی نماز سبحان اللہ! کیا شان و شوکت ہوتی ہے کہ بس دل پھٹا پڑتا ہے۔ خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں، اور چونکہ وہ عامل بالحدیث ہیں۔ آمین زور سے کہتے ہیں۔ ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون دوڑا دیتی ہے میں کبھی کبھی اسلام پر لکچر دیتا ہوں۔ مسجد بننے کی تیاری ہے۔ سید محمود صاحب کی سرگرمی نے اس کے پلین تعمیر کو نہایت وسیع کر دیا ہے۔ وہ مہتمم خاص ہیں۔ اور تین ہزار چندہ خود دیں گے۔ میں نے ۵۰۰ روپے دئیے ہیں۔ سید محمود صاحب خود ہاتھ میں پھاوڑا لیں گے اور مسجد کی نیو کھود دیں گے۔ لاگت کا تخمینہ ساٹھ ستر ہزار روپیہ ہے۔

مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے، کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے۔ اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا۔ میں اس جوش مسرت میں اور بھی لکھتا۔ مگر مجھ کو میرے بھائی خصوصاً میاں اسحاق و عثمان یاد آگئے، میرا سارا جوش اس طرح ٹھنڈا ہو گیا جس طرح طاؤس کا اپنے پاؤں دیکھنے سے۔

ان عزیزوں نے ترقی و لیاقت کا طرۂ فخر صرف لامذہبی کو سمجھا ہے۔ حالاں کہ لیاقت بھی کچھ دنیا سے نرالی نہیں، خیر خدا توفیق دے۔ میرا یہ خط اور احباب کو بھی دکھلا دیجئے گا۔

والسلام۔ شبلی ۲۰ر مارچ ۱۸۸۸ء

مولوی محمد سمیع کے نام

(مولانا کے ایک ابتدائی اور عزیز شاگرد تھے)

جان من!

عام آدمی کی بات ہے۔ کہ جب کوئی اپنا عزیز کہیں باہر رہتا ہے۔ تو احباب کو اس عزیز کے یاد آنے کے ساتھ ضرور یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ کس مکان میں ہوگا۔ کیسے بسر ہوتی ہوگی کیا شغل ہوگا۔ دوست احباب کیسے ہوں گے۔ بھائی! یہ خیال تمہیں ہو یا نہ ہو۔ مگر میں تمہاری طرف سے فرض کر کے اپنی طریق معاشرت کا خاکہ کھینچتا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں۔ کہ تم عبارت کی رنگینی اور شان و شوکت کی تلاش تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دو گے۔ اور سادے فقروں پر قناعت کرو گے میں جس مکان میں رہتا ہوں شہر کے کنارے پر ہے۔ یہ مکان ایک مختصر سا مگر خوش قطع مکان ہے۔ دکھن کی طرف ایک خوش نما محراب دار چھوٹا سا دالان ہے اس میں خاص میں رہتا ہوں۔ ایک جانب پلنگ ہے۔ اور زمین پر صاف اور پاکیزہ چاندنی کا فرش کھنچا ہوا ہے۔ صدر مقام کے داہنی جانب لڑکی جانماز اور سامنے ایک رنگین اور ہلکا سا ڈسک رکھا ہوا ہے۔ دیوار میں لیمپ لٹکا دیا گیا ہے۔ جو شب کو دیر تک روشن رہتا ہے۔ اسی دالان کے متصل ایک جانب ایک حجرہ ہے۔ جس میں مولوی عبدالغفور صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اسی دالان کے مقابل دوسری جانب ایک گول کمرہ ہے۔ جو عزیزی اسحاق کی سکونت کی جگہ ہے۔ اور جو کرسیوں اور میزوں سے آراستہ ہے۔ کمرے کے متصل جو حجرہ ہے عزیزی محمد عثمان کے رہنے کی جگہ ہے۔

میرے مکان سے متصل خواجہ محمد یوسف کا مکان ہے۔ اور وہیں ایک شاعر مشہور جو سارے شہر کے استاد اور واقعی سخن سنج اور وہیں رہتے ہیں۔ مجھ سے اکثر ملتے ہیں اور قیس تخلص کرتے ہیں۔ خواجہ محمد یوسف سے بعض کی ملاقات ہوتی ہے۔ مولوی سمیع اللہ خان سے بھی ملتا رہتا ہوں۔ اور منشی شاہ علی سے ملتے ہیں۔ میر اکبر حسین صاحب منصف سے تو خوب چھنتی ہے۔ میرے فارسی اشعار بھی انہوں نے سنے۔ اور داد دی۔ مدرسہ کے لڑکے بھی میری جماعت کے مہذب اور سخن فہم ہیں۔ افسوس ہے کہ میرے قصیدہ کی متعدد کاپیاں نہیں۔ ایک پرچہ جو میرے پاس تھا وہ اس قدر سارے مدرسہ میں ہفتوں تک دست بدست پھرا کیا کہ گل گل کر پرزے پرزے ہو گیا۔ اگرچہ بہت لوگوں نے اس کی نقلیں بھی کر لیں۔ مگر چھپا ہوتا۔ تو خوب ہوتا۔ مرثیہ (جو تم بھی دیکھ چکے ہو گے) جن لوگوں نے اس کی فارسی دیکھی ہے۔ از بس پسند فرمائی ہے۔ میر اکبر حسین صاحب بھی ان میں داخل ہیں۔

یہاں ایک شخص عبدالمجید نامی اہلمد کلکٹری ہیں یہ صاحب دیوان ہیں۔ اور کتابوں کے بڑے شائق، بہت سا حصہ ان کی تنخواہ کا کتابوں میں صرف ہوتا ہے۔ ان کا دعویٰ تھا۔ کہ کوئی دیوان ذخیرہ فارسی کا ایسا نہیں۔ جو چھپا ہو۔ اور میرے پاس نہ ہو۔ میں نے ان کو بہت سی کتابیں لکھوا دی ہیں۔ اور وہ بہت جلد ان کو منگوا لیا چاہتے ہیں۔ یہ خوب آدمی ہیں۔ ان کے ذریعے سے کتابیں دیکھنے کو خوب ملتی ہیں۔ بیچارے مفت پر کتابیں بھیج دیا کرتے ہیں۔

عثمان وغیرہ فارسی و انگریزی پڑھتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے۔ میرا اسحاق فارسی میں بھی سب سے فائق رہتا ہے۔ اور مضامین و اشعار سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ میرا ہاتھی پھر بھی لاکھ ٹکے کا نگن ہے۔ یہ سامان سادگی و طالب آملی دیکھنے کو مجھے مل جائے۔ خیر اچھی گزرتی ہے۔ اے میاں تم نے سنا نہیں۔ مصرعہ

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

سب لوگ بخیریت ہیں۔ اور سلام کہتے ہیں۔

بارے تم کو تاریخ فرزند کا مادہ پسند آیا۔ حمید کا خط آیا تمہارا بھی تو لکھا جناب حافظ حبیب اللہ خان کی خدمت میں نیاز اور دست بستہ سلام ساتھ دوکرے سے اور کیا ہو سکتا ہے۔ حضرت حافظ احسن علی صاحب اور قبلہ و کعبہ منشی خدا بخش صاحب و مولوی احمد اللہ صاحب کو تسلیم لو بھول گئے میاں حسن رضا کو سلام شوق۔ بھائی مرزا کو بھی۔ اے اور احباب کی کس خدمت کے قابل ہوں۔ خالی خولی سلام ہی سہی۔

اور تم سے بھی رخصت مانگتا ہوں۔ خط [illegible] ہے۔ معاف کرنا۔ والسلام

تمہارا نیاز مند شبلی نعمانی

۲۸ اپریل ۱۸۸۱ء

عزیز من۔

مدت سے کوئی خط نہیں آیا۔ ہمارے مولوی محمد عمر صاحب تو۔

گویا کہ ان تلوں میں کبھی تیل ہی نہ تھا۔

میاں حمید صاحب تو خفا ہو بیٹھے ہیں۔ میاں عبدالغفور نے سمجھ رکھا ہے کہ دوست کا دشمن دشمن ہوتا ہے۔ تم بھی چپ ہو۔ مولوی صاحب کے پاس اشعار جو بھیجے۔ تو تقدیم پارینہ میرا مرثیہ یا نامہ فارسی بھیجا تھا۔

چہ کنم کی ردیف کی غزل پر یہاں ایک لطیفہ ہوا۔ چند لڑکوں نے کہا کہ استاد کی غزل پر غزل لکھنی اس سے کیا حاصل

ہمتائے فلک نہ ہوگا بادل

میں نے کہا۔

دریا نہیں کار بند ساقی

غرض میری اور علی حزیں کی غزل خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز مصنف قیصر نامہ اور نیر دہلوی کے پاس بغرض محاکمہ ارسال کی گئی۔ یہ وہی نیر ہیں۔ جن کو غالب نے لکھا ہے۔

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی

فارسی نہایت عمدہ کہتے ہیں۔ اور غالب کے تلمیذ ارشد ہیں۔ دونوں نے تسلیم کیا کہ اہل زبان کا کلام ہے نیر نے تو بہت تعریف لکھی۔ اور لکھا کہ سلف کے کلام کے ہم پلہ ہے۔

دونوں صاحبوں کا خط میں نے رکھ چھوڑا ہے خط میں یہ نہیں ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ غزلیں کس کی تصنیف ہیں۔ بلکہ اسی لئے دونوں کے تخلص اڑا دئیے تھے۔

بیرنگ خط کا پروانہ جانتا۔ میں ان دنوں دیوالیہ ہوں ابھی ۱۵ روپے ایک نادر نسخے کی کتاب کے لئے روانہ کر چکا ہوں۔ ان دونوں غزلیں اور بہ تتبع علی حزیں لکھی گئی ہیں۔ اور دل چسپ ہیں۔ افسوس ہے کہ گھر پر نہ لکھ سکوں گا۔ یہاں کچھ سامان پیدا ہو گئے ہیں۔ اگرچہ ضعیف ہیں۔ واسوخت فارسی کے پندرہ بند ہیں۔ یعنی ۷۵ شعر۔ اور اسی قدر نامہ اردو کے۔ حضرت استاد نے بھی واسوخت کو نہایت پسند کیا۔ میرا قصد تھا۔ کہ صرف واسوخت اور نامہ سردست چھپ جائے۔ مگر روپیہ نہیں۔ کہیں سمیع نہ سن پائیں۔ نہیں تو روپیوں کے ڈھیر لگا دیں گے۔ کہ اتنے کے لئے چھپا کیوں بند رہے۔

مدرسہ کی مفصل کیفیت معلوم نہیں ہوتی۔ مولوی قربان علی صاحب نے لکھا ہے۔ کہ میں مدرس انگریزی کی تلاش میں سرگرم ہوں۔ ہاں قواعد مدرسہ کے نہ آنے کی شکایت لکھی ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ کہ میرا کوٹھا گرمی کے قابل نہیں۔ مگر میں عبداللہ خان کے مکان پر رہنا پسند نہیں کرتا۔ مجھ سے تم لوگوں کے بغیر کہیں رہا جائے گا؟

اچھا وہ سلاموں کا پشتارہ تو سر پر لے لو۔ اور سب کے حصہ کا تقسیم کر دو۔ جناب حافظ حبیب اللہ صاحب، جناب حافظ احسن علی صاحب، جناب منشی خدا بخش صاحب۔ بوڑھے تو شاید ہو لئے۔ چلو اب جوانوں سے شروع کرو۔ مولوی احمد اللہ صاحب، فخر الملۃ والدین کہیں ف الما نہ جانا۔ منشی حسن رضا خان صاحب، منشی ولی جان صاحب، ہماری شادی ٹھیراتے ہی رہ گئے۔ میاں خادم حسین صاحب۔ ہے ہے بڑی سخت غلطی ہوئی۔ سلام کا نام کسی کے نام کے ساتھ ملا کر یا نیچے لکھنا تھا۔ اگرچہ ٹاٹ میں مونج کا بخیہ سمجھا جاتا۔ مکرمی مولوی محمد عمر صاحب کیا خطوں کا جواب نہیں دیتے۔ تو سلام کا جواب بھی نہ دیں گے۔ افتخار القوم حضرت ماموں محمد حلیم صاحب دام فیضہ علینا جناب مکرمی محمد حسین صاحب۔ گھر جانے وہ کہاں ہوں۔ میرا سلام مفت میں خاک چھانتا پھرے۔ کوئی بھول تو نہیں گیا۔ اوہا

مرزائے منتظر میاں سلیم اللہ صاحب رہ گئے۔ اتنا سا تو اللہ مجھ میں نظر آہئی، تو گویند کہ ایک اور میرا مانیہ فخر زندہ رہ گیا۔ جناب مولوی مرزا محمد سلیم صاحب خیر انہیں کے صدقے مرزائے منتظر بھی یاد آگئے تھے۔ فقط

یو نیکاں بہ بخشد کریم

اب تو چھوٹے چھوٹے عزیز رہ گئے۔ ان کو میرا سلام و دعا۔ چھوٹے ہی مزے میں رہے سلام و دعا دونوں۔ سب کے نام کی تو اب جگہ نہیں کاغذ میں ورنہ دل میں تو سبھوں کی جگہ ہے ایک وہ کا نام حسن اور محمد عثمان و سلیمان، یونس علاء الحق۔

والسلام
شبلی نعمانی ۲۴ر اپریل ۱۸۸۸ء

میاں محمد یحییٰ۔

بھائی عجیب معاملہ ہے۔ خود تم بھی سنو۔ اور انصاف کرو کہ کس کا حق بجانب ہے۔ میں نے وہ ۲۰۰ روپیہ (ہاں یہ بھی یاد رہے کہ پورے دو سو (۲۰۰) نہ تھے۔ کیونکہ ایکسچینج کی وجہ سے مجھ کو صرف (۱۹۰) یا اس سے کچھ زیادہ پہنچے تھے۔ میں نے یہاں آکر اپنے پاس سے دو سو روپیہ پورا کر دیا) مولوی محمد عمر صاحب کے پاس بھیج دیے۔ کہ وہ امر مرحوم کی یادگار میں چھوٹے چچا کے نام سے جمع کر دیں۔ اور چچا کو نہایت شکر گزاری کا خط لکھا اور اطلاع دی۔ کہ وہ روپے آپ کے نام سے اس طرح جمع کر دیے گئے چونکہ مجھ کو خیال تھا۔ کہ وہ واپس لینا گوارا نہ کریں گے۔ اور میں خود اپنے پاس رکھنا پسند نہ کرتا تھا۔ اس لئے ایسی صورت نکالی۔ کہ دونوں مطلب نکل آئیں۔ اب تماشہ یہ ہے کہ چچا صاحب وہ روپیہ لئے لیتے ہیں اور میاں اسحاق بھی ان کی تائید پر آمادہ ہیں۔ میں سخت حیرت میں ہوں کہ جو روپے کسی کو دے دیے ان کا واپس لینا کون سی ہمت ہے۔ میاں اسحاق کہتے ہیں۔ کہ بندہ دل کے دائرہ میں ہمت کا ایک پیمانہ ہے۔ تم ہیکڑوں کی باتیں کرتے ہو۔ مجھ کو افسوس ہوتا ہے۔ کہ آج بھی مرحوم زندہ نہیں اور نہ دکھا دیتا کہ بندہ دل میں ہمت کا اور بھی معیار ہے۔ انہوں نے نیشنل اسکول میں پانچ سو روپے دینے کہے تھے اور سو روپے (۱۰۰) دے بھی دیے۔ اور تقاضا کیا جاتا تو سب وصول ہو جاتا۔ حالانکہ مجھ کو تعجب اور سخت تعجب ہے۔ غالباً چھوٹے چچا کو ایسی پست ہمتی پسند نہ ہو لیکن میاں اسحاق اور چچا نہیں مانتے خیر اچھا ہوا۔ میں سبکدوش ہو گیا۔ اور بندہ دلی کی نئی اصطلاح سمجھ میں آگئی۔ خود تم بھی تو اپنی رائے ظاہر کرو۔ لیکن خدا لگتی کہنا۔ رعایت کو دخل نہ ہو

والسلام
شبلی نعمانی۔ ۱۴ر فروری ۱۸۹۲ء

او بھائی! ہم لوگوں کا ایک ستون کم ہو گیا۔ عزیزی مہدی نے جان دی۔ اور کس حالت کے ساتھ کہ کلیجے کے ٹکڑے اڑ گئے میں بدبخت پاس تھا اور اس لئے جتنے تیر چھپکے سب میرے ہی جگر پر لگے۔ ہائے اس کی جوانا مرگی! ہائے کیا معلوم تھا۔ کہ وہ اس قدر جلد دنیا سے جائیگا ورنہ مجھ پر لعنت اگر میں اس سے ناراض رہتا۔

ہائے! سب برائیوں پر وہ سب سے اچھا تھا۔ آج چوتھا دن ہے لیکن خدا کی قسم اس وقت تک دل نہیں ٹھہرتا سو بار رو چکا ہوں۔ اور دل نہیں ٹھہرتا۔ اس کی ایک محبوب یادگار ہے جس کو وہ بہن کہتا تھا یعنی شاکرہ اس سے بار بار لپٹ کر رو رہا ہوں۔ لیکن کچھ بھی تو تسلی نہیں ہوتی۔ اس کو تسلی دینا چاہتا ہوں۔ لیکن خود بیقرار ہو جاتا ہوں۔ ایک اور اس کے نام سے وابستہ بدقسمت ہے۔ جو پہلے چھوٹی بھاوج تھی۔ لیکن اب پیاری بہو ہے۔ تم لوگ مزے سے باہر ہو۔ ہاں آفت زدوں کو سنبھالنا میرے سر پڑا ہے۔ ہائے مہدی وائے مہدی

بدبخت ازلی
شبلی نعمانی
(۲۱ر جولائی ۱۹۰۷ء اعظم گڑھ)

خط پہنچا۔ جو خبریں مشہور ہیں۔ وہ صحیح نہیں۔ بے شبہ یہاں میری بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ میرے لکچر یہاں کے لوگوں کے اصرار سے دیا گیا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ خود وزیر عدالت صدر انجمن ہوئے۔ نواب مدارالمہام بہادر یعنی وزیراعظم نے نہایت احترام سے شرف نیاز دیا۔ اور مجھ کو یہاں کے قیام کی ترغیب دی۔ لیکن کام کی بات ابھی کوئی نہیں۔ میری ملازمت کا تحریری حکم ان کا آگیا لیکن میں نے اس کو منظور نہیں کیا۔ بہت بڑی کامیابی ہوتی۔ لیکن بدقسمتی سے وزیراعظم اور حضور کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ وزیراعظم کے اختیارات حسب قانون حضور نے بالکل گھٹا دیے ہیں۔ اور اس وجہ سے ہر کام میں حضور سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ یہ صرف چند روز سے ہوا ہے۔

بہر حال دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ بے شبہ اگر میں ملازمت کر سکتا۔ اور کسی قدر دنیاداری بھی مجھ سے بن پڑتی۔ تو دنیاوی فائدے بہت حاصل ہوتے۔ لیکن میاں عمر کا بڑا حصہ صرف ہو چکا۔ چند برسوں کے لئے دامن زندگی کو کیا آلودہ کروں؟ دعا کرو۔ کہ جو گردن ہمیشہ بلند رہی۔ بلند ہی رہے۔ گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچایا۔ سلامتی میں اپنے گوشۂ عافیت کو ننگ تماشے کم نہیں سمجھتا ہوں۔

میاں کے تیر و نشتر آتے رہتے ہیں۔ اور کلیجے کو چھلنی کیے دیتے ہیں بہت کچھ ارادہ ہجرت کا ہے۔ اگر سرِ یہ پہنچ گیا۔ تو تمام جھگڑوں سے نجات ہو جائے گی۔ والسلام۔

شبلی نعمانی
۱۴ر اپریل ۱۹۰۱ء۔ حیدرآباد

عزیزی!

شعر العجم کا نا مقبول ہونا معلوم تھا۔ لیکن "یک کس مردہ باشد مردہ باشد از خاطر جمعیت تباید گزشت" ایک علمی کتاب ناول نہیں بنائی جا سکتی تھی۔ جب سے شائع ہوئی ہے ہر طرف سناٹا ہے۔ حسن ظن کی بنا پر کچھ لوگوں نے منگوائی۔ وہ بھی پچھتاتے ہوں گے۔ لاگت بھی وصول ہونے کی امید نہیں۔ مقدور والوں کو کتاب مستعار دینا یورپ کے اصول کے خلاف ہے۔ مسلم لیگ کے تقاضہ پر دلی جا رہا ہوں۔ وہاں سے اگر جون پورا سکول گا۔ جو خط کسی قدر خاص ہوں۔ ان کو سید سلیمان کے پاس نہ بھیجو۔ فرصت کے وقت میں خود دیکھ کر فیصلہ کروں گا۔

شعر العجم کے دوسرے حصے کس قدر دلچسپ ہیں۔
شبلی ندوہ ۷ر جنوری ۱۹۱۱ء

مولانا حبیب الرحمان خان صاحب شروانی
رئیس بھیکم پور (علیگڑھ) کے نام

جیسے آج معارف آیا۔ ریویو پڑھا۔ اور بار بار پڑھا۔ خدا کی قسم دیر تک ایک کیفیت طاری رہی۔ اگر خودستائی کا پہلو نہ نکلتا۔ تو میں اس کو الفاروق کے ساتھ شامل کرکے شائع کرتا۔ زور تحریر، جدت استعارات، واقعہ طرازی کس کس چیز کی داد دوں۔ ہاں ایک بات سنئے۔ یہ زور قلم مضمونوں اور رسالوں پر ہی ختم نہیں ہونا چاہیے۔ وسعت خیال اب مستقل تصنیف۔

کا میدان چاہتی ہے۔ متوجہ ہوجیے اور کوئی مفید سلسلہ چھیڑ دیجیے۔

ہاں ایک اور بات ہے آپ کی کانفرنس اٹلی میں ہے۔ آرنلڈ ۲۰ر جولائی کو روانہ ہوں گے۔ مجھ کو بلاتے ہیں۔ میں ضعف کی وجہ سے رک سکتا ہوں۔ اگر آپ کی ہم سفری کی امید ہو۔ تو میں قوی ہو جاؤں گا کیا آپ قصد کر سکتے ہیں؟ ہم اسی سیر میں ممالک اسلامیہ کو بھی پلٹتے آئیں گے۔ پانچ سات سو کا خرچ ہے آپ چاہیں تو ذرا ٹھہر کر بھی چل سکتے ہیں۔

والسلام

شبلی ۵ر جولائی ۱۸۹۹ء

مخدومی!

میں انبتہً بہت اچھا ہوں۔ تاہم ضعف اس قدر ہے۔ کہ دس منٹ تک بات نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے لیے تین تجویزیں پیش نظر رکھیں تھیں۔ قرآن مجید پر ریویو (نعوذ باللہ جرح مراد نہیں)، اس میں فن بلاغت و فلسفۂ کلامیہ کے دقیق مطالب ادا ہوتے۔ عرب کی شاعری کی تاریخ۔ امام غزالی کی لائف جس میں علم کلام پر پورا ریویو ہوتا۔ کیونکہ موجودہ علم کلام کے موجد وہی ہیں۔ ان میں سے آپ جو پسند کریں۔ میں اس کو چھوڑ دوں۔ ہاں ایک مضمون اور ہے یعنی مسلمانوں کے فن تاریخ کی تاریخ۔ لیکن یہ بہت استقراء چاہتا ہے جس کے لیے آپ ابھی تیار نہیں ہو سکتے آپ کو اگر یہ مرغوب ہو۔ تو فارسی شاعری کی تاریخ اور عہد بہ عہد کی خصوصیتیں اور فرق لیجیے۔ ان تمام مضامین میں آپ کو اصلی کام دے سکتا ہوں۔ مواد تحریر، عنوانات مضامین وغیرہ وغیرہ سب سامان مہیا کر دوں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم آپ مل کر کوئی کتاب لکھیں۔ اور ترکوں کی طرح وہ مرکب نام سے شائع ہو۔ مثلاً حبیب شبلی۔ الغرض جدھر رخ کیجیے۔ میں حاشیہ برداری کے لیے حاضر ہوں۔ یورپ کی سیر سے ناحق آپ نے جی چرایا۔ ایسا موقع قیامت تک نصیب نہ ہوگا۔

شبلی

۱۸ر جولائی ۱۸۹۹ء

مخدومی۔

بات تو کچھ نہیں، لیکن مولوی عبدالحق صاحب کی بہانہ جوئی اور آپ کے خارق العادت ہونے پر تعجب آتا ہے۔ یہ امر معمولی حیثیت سے نہیں، بلکہ رد و کد کے ساتھ ظہور میں آیا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ انگریزی کے مسئلہ پر گفتگو نہیں ہوتی تو میں نے کسی قدر سختی کے ساتھ کہا کہ اس سے کیوں گریز کیا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص محرک نہیں۔ میں نے کہا کہ میں ہوں، باقاعدہ میرا نام لکھا جائے۔ مولوی یونس خان نے کہا میں تائید کرتا ہوں۔

البتہ آپ کی خاطر سے میں نے پھر اس پر بحث نہیں کی۔ اب بحث طلب صرف یہ امر ہے کہ میں نے ناظم سے کہا تھا نہیں، کہ میرے نام سے یہ تحریک لکھی جائے۔ اگر میں نے کہا تھا تو انہوں نے لکھا کیوں نہیں؟ نہیں لکھی تو کیوں؟ اور لکھی۔ تو اس کے درج کارروائی کرنے سے کیوں انکار ہے؟ صدر انجمن کو یہ حق البتہ ہے کہ کسی تحریک کو پیش کیے جانے سے روک دے۔ یہ حق نہیں۔ کہ یہ بھی کارروائی میں درج نہ ہونے دے۔ کہ فلاں شخص نے اس کو پیش کرنا چاہا تھا۔ یا پیش کیا۔

جلسہ کے بعد میں نے آپ سے پوچھا۔ کہ آپ کیوں اس قدر اس بحث سے کتراتے ہیں؟ آپ نے کہا تمہاری بدنامی کے ڈر سے۔ باوجود ان تمام باتوں کے۔ اگر آپ کو یہ تمام معرکہ بھول گیا تو نظیری کا یہ مصرعہ سمجھ میں آگیا۔

آنکہ نسیان آورد خاصیت یاد من است

مجھ کو اس تمام بے اعتنائی پر واقعی رنج و افسوس ہے۔

والسلام

شبلی ۔ علی گڑھ دسمبر ۱۹۰۱ء

تسلیم۔ والانامہ پہنچا۔ میری حالت اب بھی کالمعلقہ ہے۔ شاید دو ایک مہینہ میں کوئی فیصلہ ہو۔

نصاب دینیات کے متعلق آپ نے جو مجبوریاں لکھیں ان کا علاج میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آتا۔ علم کلام کے متعلق میری کتاب اگر کبھی تیار ہوئی۔ تو شاید اس کے کچھ اجزا آپ کے کام نکلیں۔ جلد الوسیط پہنچ گیا۔ اس کی نقل کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ ہاں مولوی سید علی صاحب کی علالت کی وجہ سے کتاب آلات کی تصاویر کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔ اب آپ کی کتاب واپس بھیج دوں۔ یا کیا کروں۔ غزل دیکھی۔ ماشاء اللہ اب تو آپ بہت پختہ کہنے لگے۔ اب کے بھی نکتہ چینیاں کی تھیں لیکن زبردستی ڈھونڈ کر نکالی ہیں۔

ز رشک حسن تو تلخ است عیش شیریں را
شتاب زلف سیاہ است روئے لیلیٰ را۔

ترصیع کا توازن چاہتا ہوں۔ کہ دوسرے مصرعہ میں بھی خطاب کا حرف ہو۔ شتاب زلف تو الخ۔

ز عکس روئے تو آئینہ دلکش گوہر
بہ نطق شاد کن طوطی شکرخا را

پہلے مصرعہ میں فعل نہیں۔ اور دوسرے میں ہے اس سے دونوں مصرعوں کا توازن اور تقابل کم ہو جاتا ہے۔ ترصیع میں اس کا لحاظ رکھتے ہیں۔

میں نے بھی ایک نظم لکھنی شروع کی ہے۔ جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

اے دکن ایکہ بہار چمن جان از تست

جان قافیہ ۔ اس کا ایک شعر زمانہ حال کے موافق ہے۔

چوں تو ماندگہ زہر رہ برآورد صد نقش
گرنہ نیرنگی این گنبد گردان از تست!

اور سنیے۔ حیدرآباد کی جامعیت جہاں بیان کی ہے۔ اس انداز سے بیان کی ہے۔

ہندیان نیز چہ از حلقہ بگوشان تو اند
ہرچہ زیشان بود آن نیز کنوں ہاں از تست
ہاں تو دعوی کن و ما نیز مسلم داریم!
شبلی سحرفن و دائم غزل خوان از تست

والتسلیم

شبلی ۔ حیدرآباد

مکرمی۔

والانامہ اور مسودہ پہنچے۔ علمائے ادب کہتے ہیں کہ حسان جاہلیت کے نامور شعرا میں تھے لیکن اسلام آیا۔ اور نعت کہنی شروع کی۔ تو ان کا کلام رتبہ سے گر گیا۔ فارسی میں دیکھیے۔ نعت گو بہت کم پیدا ہوئے۔ خسرو کے سوا۔ اور خیر جامی بھی ہیں۔ باقی جتنے ہیں۔ نہایت کم رتبہ ہیں۔ اور صاف نظر آتا ہے کہ نعت گوئی نے ان کو ایسا بنا دیا۔ یہ ہے۔

رہ بوسہ تیغ است قدم ما

مقصود اس طول نفسی سے یہ ہے کہ آپ بھی اس میدان میں نہ آئیے ثواب مقصود ہے۔ تو درود پڑھ لیا کیجئے۔ معاف فرمایئے۔ نعت کی غزل صرف پھیکی نہیں بلکہ غلطیوں سے مملو ہے۔ سنئے

بہ آستان پاک، رساں نامہ تا لبم

نامہ خالی اردو ہے۔ فارسی نہیں۔ یا شاید میری نظر کا قصور ہو۔ لغت دیکھیں ہو۔ تو لکھ بھیجئے گا۔

اے فخر اولین و مباحات آخرین

موجب مباحات۔ یا اس قسم کا اور کوئی لفظ مباحات سے پہلے چاہیے ورنہ معنی صحیح نہ ہوں گے

جود جلالت خاتمیم - خولی جود کو جلال سے کہنا صحیح نہیں، جب وہ لائے تو بسر خاکسار من ۴۱ اس موقعہ پر سر کے ساتھ خاکسار کی قید خلاف مذاق ہے۔

"رو سر بشکر حق ز تو لالی آیم"

رو سر کی ترکیب بے مزہ ہے۔ خصوصاً اس موقع پر۔ مدینہ کی غزل بھی بہت پھیکی ہے اس کو یوں ہی چھوڑتا ہوں۔

مز طیبہ غزل نہایت چست اور فارسی انداز ہے

بر دہان بذلہ سنج و پستہ لب
غنچہ کے دارد مجال برتری

پستہ لب کو غنچہ سے کیا مناسبت؟ "جان قربان ادای دلبری" میں جان کی نون کا اعلان جائز بھی ہو۔ تو بھی بالکل خلاف فصاحت ہے۔

"از پرتو حسن محبوب است کہ افتادہ" ساقط الوزن ہے۔

پائی ہر قطرہ گہر ریختہ معانی را
کردی قربان بہ ہر شعر معانی را
پائی میں ی گرتی۔ کردی۔ ایضاً

مدراس ضرور تشریف لائیے۔ مجاز قنطرۃ الحقیقہ ہے۔

شبلی کا گھر بھی خانہ دشمن کے پاس ہے۔
محشر خرام اور بھی دو ایک قدم سہی

دسمبر ۱۹۰۱ء

مکرمی۔

خط پہنچا۔ خدا کی قسم غزل کی غزل مرصع ہے۔ اور یہ شعر تو دل میں رکھ لینے کا ہے۔

اگر بپا فگند از رخ نقاب را چہ کنم

لیکن داد دینے کا مزہ رہ رہ گیا ہے۔ خدا کے لئے مدراس ضرور آیئے حیدرآباد اگرچہ دیکھنے کے قابل نہیں رہا۔ سید حسن۔ سید علی میں سے کوئی نہیں۔ عزیز مرزا باہر ہیں۔ تاہم معلوم

خزان کشیدہ ہم بہار سے دارد

آپ کی کتابیں بھیج دوں گا۔ لیکن بلا تصویر۔ ایک راز کی بات کہتا ہوں۔ اپنے ہی تک رکھیئے گا۔ آپ کو معلوم ہے۔ والد قبلہ نے تیس ہزار قرض چھوڑا تھا۔ اس میں سے اب چار ہزار اور رہ گئے ہیں۔ اس کے مارے۔ میں غربت کی خاک چھانتا پھرتا ہوں۔ ورنہ کس کم بخت کو نوکری کی غرض ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ اپنا کتب خانہ کل فروخت کر ڈالوں۔ کتابیں میرے پاس تعداد میں بہت نہیں ہیں۔ لیکن اکثر نایاب مطبوعات یورپ اور بعض نایاب قلمی کتابیں ہیں۔ باقی تین ہزار کا اور کچھ سامان کر لوں گا۔ اگر میاں استقلال ہو جاتا۔ تو میں کل سامان کر لیتا۔ لیکن ہر نفس نفس واپسین ہے۔ والسلام شبلی ۱۷ر دسمبر ۱۹۰۲ء۔

مکرمی۔

تسلیم۔ خدا کے فضل سے سب کام شروع کر دیئے گئے۔ ترجمہ قرآن مجید کے لئے متعدد شخصوں کو خط لکھے۔ کسی نے کوئی تسلی کی بات نہیں لکھی۔ لیکن عماد الملک بلگرامی نے خط لکھا۔ کہ وہ نہایت مستعدی سے اس کام کو کر رہے ہیں۔ ان کے خط کے اقتباسات آ کر چھاپوں گا۔

اشاعت اسلام کے لئے مجھ کو خود ایک بار دورہ کرنا ہے۔ میں ایک مہینہ سے پیچش میں مبتلا ہوں۔ اسی غرض سے الہ آباد بھاگ گیا تھا۔ لیکن نواب وقار الملک اپنے لڑکے کو داخل کرانے آئے تو مجھ کو بلا بھیجا۔ اس لئے آنا پڑا۔ اسی حالت میں وہاں سے بریلی گیا۔ اور جلسہ عام کر کے اس کی بنیاد ڈالی۔ چھٹیاں پڑنے پر عام دورہ شروع ہوگا۔

وقف کے دستخط کے لئے محمد ظہور کو بھیجا ہے۔ تو اشاعت اسلام کے متعلق لوگوں کو خطوط لکھ دے دیئے ہیں۔ دیکھئے لوگ کیا جواب دیتے ہیں۔

وقف کی میموریل لکھنے کو کوئی مسلمان نہیں تھا۔ میور گزٹ الہ آباد میں تیج بہادر سپرو جو ہندوستان ریویو نکالتے ہیں یہاں سے خواہش ظاہر کی۔ وہ فارسی سے آشنا ہیں۔ اور شعر العجم کے معترف اس لئے خود ملنے آئے۔ اور مجھ سے تمام کاغذات لے گئے۔ اور کہا۔ کہ یہ سب پڑھ کر جواب دوں گا۔

صیغۂ تعلیم اغلاط تاریخی کے متعلق سید سلیمان نے خط شائع کرا دیا۔ اور لوگوں نے خطوط بھیجے۔ سید سلیمان اب کام شروع کرتے ہیں۔

بڑی دقت یہ ہے۔ کہ دیہات میں جا کر تلقین اسلام کرنے والے واعظ نہیں ملتے۔ اس کا کیا علاج ہوگا؟ اشاعت اسلام کی کارروائی تمام تر اسی پر موقوف ہے۔

آزاد کلکتہ پہنچے۔ سخت پریشان ہیں۔ سید سلیمان میرے خطوط جمع کر رہے ہیں کیا آپ کے پاس میرے کچھ خطوط اتفاق سے محفوظ ہوں گے۔

ہاں عربی زبان میں الیڈ کا ترجمہ ہوا۔ مصنف دائرۃ المعارف نے کیا۔ اور بڑے اہتمام سے کیا یہاں تک کہ مصر کے سو (۱۰۰) فضلا نے اس تقریب میں ڈنر دیا۔ مترجم نے دو سو (۲۰۰) صفحوں کا دیباچہ بھی لکھا ہے۔ ۲۳ روپے قیمت ہے۔ میں نے ایک نسخہ منگوایا ہے۔ آپ چاہیں۔ تو آپ کو بھی منگوا دوں۔

شبلی ۸ر مئی ۱۹۱۱ء

مکرمی:۔

تسلیم۔ میں اردو ورنیکلر ایجوکیشن کی شرکت کی غرض سے الہ آباد گیا تھا۔ مسٹر ب نے چند نہایت مضر تجویزیں اردو کے حق میں پیش کی تھیں۔ ایک یہ بھی تھی کہ مڈل تک بجائے انٹرنس کے امتحانات میں لازمی کر دی جائے۔ اور اردو جو مدارس میں ہے۔ وہ ایسی کر دی جائے کہ ہندی بن جائے۔ عجیب منطقی دلائل گزرے تھے۔ پنڈت سندر لال ریویو کمیٹی کے ممبر تھے۔

تیسرے جلسہ میں کامل فتح ہوئی۔ تمام تجویزیں اڑ گئیں۔ اگرچہ افسوس ہے۔ کہ مسلمان ممبروں نے کوئی مدد مجھ کو نہ دی۔ اور دیتے کیا۔ وہ اس کے قابل بھی نہ تھے۔

الہ آباد سے کلکتہ گیا۔ اور تمام وائسرائے کونسل کے ممبروں کو ایک جلسہ میں جمع کر کے تمام مراتب طے کر لئے۔ انشاء اللہ اسی مہینہ میں بل حسب مراد پاس ہو جائے گا۔ اور سب کمیٹی بیٹھ جائے گی۔ سیرۃ نبوی کا کام واقعی بڑے پھیلاؤ کا ہے۔ ادھر اشاعت اسلام کی یہ حالت ہے۔ کہ سینکڑوں خطوط اور رپورٹیں آ رہی ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ لاکھوں نومسلم ارتداد کے خطرہ میں ہیں۔ آریوں کی مقامی کمیٹیاں جا بجا دیہات میں قائم ہوتی جاتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ کہاں کہاں واعظ مقرر کئے جائیں۔ کہاں مکتب قائم ہوں۔ یہ تو سلطنت کا کام ہے

آج ایک اپیل بھیجتا ہوں، کہ افتتاحی جلسہ میں پیش کروں گا۔ کلکتہ میں ایک انجمن سے کام لیا، اور نواب ڈھاکہ کو راضی کیا ہے، کہ وہ انجمن اشاعت اسلام کے پریسیڈنٹ ہوں۔ لطف یہ ہے، کہ ادھر شاہ سلیمان صاحب نہ کچھ کرتے ہیں، نہ مجھ کو اجازت دیتے ہیں کہ میں باقاعدہ کام کروں۔ مجبور ہو کر ندوہ کے دائرہ سے نکل کر کام کرنا پڑے گا۔

یہ انجمن کا جلسہ پارک نیبروام میں ہوا۔ ۱۷ مارچ ۱۹۱۲ء کو پھر الہ آباد ریگولیشن کمیٹی میں جانا ہے۔ ہاں ایک نہایت عمدہ خوش خبری سنیئے۔

گورنمنٹ نے ایک کمیٹی قائم کی ہے، کہ سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم جاری کی جائے مجھ کو بھی ممبر بنایا ہے۔ اپریل کی چھ تاریخ کو اس کا اجلاس ہوگا۔

شبلی

۱۰ مارچ ۱۹۱۲ء لکھنؤ

(ایک خط عام، جو بعض ارباب علم کو مولانا نے بھیجا تھا)

جناب من:۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ سیرت نبوی آج زیر تصنیف ہے۔ میں چاہتا ہوں، کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت صلعم کے متعلق لکھا ہے، اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تاکہ ان کے تائیدی بیان حسب موقعہ حجت الزامی کے طور پر پیش کئے جائیں اور جہاں انہوں نے غلطیاں اور بد دیانتیاں کی ہیں، نہایت زور و قوت کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔

اسی بناء پر انگریزی کی کثرت سے تصنیفات مہیا کی گئی ہیں جو آنحضرت کے متعلق تصنیف ہو چکی ہیں، لیکن ان سب کا اردو میں ترجمہ کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے یہ رائے قرار پائی ہے کہ جن صاحبوں کو اس سے ذوق ہو۔ ان کے پاس ایک ایک کتاب بھیج دی جائے وہ مطالعہ فرما کر قابل ترجمہ مقامات پر نشانات کرتے جائیں۔ اور پھر کتاب واپس بھیج دیں، تاکہ دفتر کے مترجمین سے ترجمہ کرایا جائے۔

اسی بناء پر آپ سے درخواست ہے، کہ آپ بھی اس کام میں حصہ لینا پسند فرمائیں گے۔

شبلی نعمانی

۱۴ اگست ۱۹۱۲ء

(منشی محمد امین کے نام)

منشی محمد امین صاحب زبیری اس زمانہ میں بھوپال میں مہتمم دارالانشاء تھے، ہندوستان کے ممتاز مصنفین میں ان کا شمار ہے اب کراچی میں مقیم تھے۔ اور باوجود پیرانہ سالی تصنیفی مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ علیگڑھ سے بھی ان کا نہایت گہرا تعلق رہا ہے۔ نواب وقار الملک کے سوانح زندگی پر وقار حیات کے نام سے کتاب لکھی ہے۔

ستمبر ۱۹۵۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

(مرتب انتخاب)

محبی!

پیچ پر پیچ ہے تو
اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

واقعہ یہ ہے، کہ علیگڑھ اور ندوہ کو ریاست سے جو فوائد پہنچ رہے ہیں اس کا سہرا جناب آپ ہیں جزاک اللہ خیرا۔ ریاست کے عطیہ کی درخواست تو کی، لیکن اب قبول کرتے ایک بڑا بار محسوس کرتا ہوں۔

میں آج کانپور روانہ ہوتا ہوں۔ نو مسلموں پر آریہ جو جال ڈال رہے ہیں وہ سخت خطرناک درجہ تک پہنچ گیا ہے۔ اس غرض سے تمام اضلاع میں دفاعی انجمنیں اور دیہات میں مکاتب قائم کرنا مقصود ہے۔ لیکن چونکہ گرمی سخت ہو رہی ہے۔ اس لئے یہ دورہ مختصر ہوگا۔ اسی طرف سے بھوپال آؤں گا۔ پھر بنگلور یا بمبئی جاؤں گا۔ کتابیں ساتھ نہیں جا سکتیں، صرف اشاعت ساتھ جا سکتا ہے۔ اس لئے سیرۃ النبوی کا کام باضابطہ بارش سے شروع ہوگا۔ یہ بھی خیال ہے کہ یہ کام کسی طرح دو برس میں انجام نہیں پا سکتا، اس پر مستزاد یہ ہے کہ ایک آنکھ میں پانی اتر رہا ہے۔ اس لئے جلدی بھی کرتا ہوں۔ کہ کچھ کر لوں۔ ندوہ جس قدر میں کر سکتا ہوں اتنا کرنے والا بھی نظر نہیں آتا۔ کتابوں کی فہرست تیار ہو رہی ہے۔ بہت سی کتابیں تو خود ندوہ میں موجود ہیں۔ ندارد جو مطلوب ہیں، ان کو منگوانا ہے اشاعت کی فکر نہ کیجئے۔ میں خود کر سکتا ہوں۔

شبلی نعمانی

۱۷ اپریل ۱۹۱۲ء

(مولانا ابو الکلام آزاد ایڈیٹر الہلال کے نام)

مولانا ابو الکلام آزاد نے کم سنی میں الہلال ہفتہ وار جاری کیا۔ اور اس ملک میں صوری و معنوی اعتبار سے آج تک کوئی دوسرا جریدہ الہلال کی گرد کو چھو نہیں سکا ہندوستان کی قوم پرستی کی تاریخ میں غالباً وہ واحد مسلمان تھے۔ جنہوں نے تقسیم ہند کے بعد بھی ہندوؤں کا ساتھ دیا وہ اس زمانہ کے ایک عالم بے بدل تھے۔ ان کی خطابت و صحافت دونوں بے مثل تھیں انہیں اللہ تعالیٰ نے ایک ذہن رسا اور علم دین بخشا۔ ان کے قلم کو بہار کی رنگینی اور ذوالفقار کی سی تیزی میسر تھی۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف [illegible] جہاد میں مصروف رہے۔ بڑے بے بدل انسان تھے۔ مسلمانوں سے ان کی سیاسی علیحدگی عام بالخصوص پاکستان کے مسلمانوں کے لئے وجہ شکایت بنی رہی۔

(مرتب انتخاب)

برادرم۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس وقت کانپور کے سوا کوئی آواز کچھ اثر نہیں رکھ سکتی۔ لیکن اب گورنمنٹ بھی سختی اور پامردی پر آمادہ ہے۔ ہزآنر نے سنڈیکیٹ کو سوکھا جواب دیا لکھنؤ میں اعانت کا جلسہ یکسر روک دیا گیا جشن نظامی وغیرہ کو کلکٹر نے بلایا۔ میں نے نظم مختصر کانپور کے متعلق زمیندار میں بھیج دی ہے گو کسی قدر موثر ہے، تاہم بہت احتیاط کی ہے کلکتہ آنے کو سو سو بار جی چاہتا ہے۔ لیکن کیا کروں؟ سیرۃ کے لئے کتابوں کی کئی الماریاں ساتھ رکھنی پڑتی ہیں۔ ان کو کہاں کہاں لئے پھروں۔ یہاں ندوہ ہی سے متعدد بھی کتابیں مل جاتی ہیں، اس پر بھی بہت سی خریدنی پڑیں۔ ایک کافی ذخیرہ ساتھ آیا تھا۔ پھر بھی ہر قدم پر ضرورت پیش آتی ہے۔ چونکہ بہت کچھ کام ہو بھی چکا ہے۔ اس لئے اب ہر منٹ گراں معلوم ہوتا ہے۔ اور جی چاہتا ہے۔ کہ جلد سے جلد پریس میں جا سکے۔

عماد الملک بلگرامی تقریباً حیدرآباد بلاتے ہیں۔ لیکن پس و پیش میں ہوں۔ اتنے دن کیوں ضائع کئے جائیں۔ عماد الملک ترجمہ قرآن میں مصروف ہیں۔ لکھا ہے، کہ پندرہ پارے ہو چکے۔ آپ نے بہت اونچا نصب العین رکھا ہے۔ ورنہ جی یہ چاہتا تھا، کہ سب طرف سے قطع نظر کر کے وہیں آ رہتا۔ اور آپ کے ساتھ مل کر کوئی ضروری خدمت انجام دیتا اس وقت

مسلمان سخت پراگندہ اور پریشان خیال اور پریشان عمل ہو رہے ہیں۔ کسی خاص مرکز پر ان کو لانا ہے۔ ورنہ ہر طرف سے بھٹکتے بھٹکتے آخر بالکل برباد ہو جائیں گے۔

مریضہ کی نسبت آپ نے نہیں لکھا۔ کہ ان کو کہاں تک فائدہ ہوا۔ یہ تو آپ کو لکھ چکا ہوں۔ کہ میری جدید نظمیں علیگڑھ والے چھاپ رہے ہیں۔ کشافیات پر بھی ان کی نظر ہے۔ لیکن اس کا سلسلہ اگر ہو گا۔ تو الگ ہو گا۔

ہاں عطیہ فیضی کے یہودی شوہر نے جو آرٹسٹ ہے۔ میری تصویر ہاتھ سے کھینچی ہے ابھی پوری تیار نہیں ہو چکی ہیں اس کا فوٹو لے کر آپ کو بھیجوں گا۔ نائب سیکرٹری جو نہایت خوبصورت شخص ہے۔ اس نے خواہش کی۔ کہ اس کے ساتھ تصویر کھنچواؤں۔ چنانچہ ایک انگریزی کارخانہ میں فوٹو لیا گیا۔ توفیق آفندی بھی گروپ میں ہے۔

شبلی نعمانی
۱۰ر اگست ۱۹۱۳ء

عبدالماجد بی۔ اے کے نام

مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق لکھنؤ جس کی بیش تر باتیں پاکستان کے اخبارات میں التزام کے ساتھ شائع ہوتی ہیں ان خوش نصیب انگریزی خوانوں میں سے ہیں۔ جنہیں ذوق سلیم اور علم دین کے ساتھ مذہبی خدمت کی توفیق ارزانی ہوئی ہے آپ کو اس دور کے علماء اور سیاسی رہنماؤں کی صحبت میسر آئی۔ اور ان کے کاموں میں وہ شریک رہے انہیں انگریزی زبان پر ایک قابلِ رشک عبور حاصل ہے۔ اور اردو میں تو ان کا کوئی حریف نہیں۔ آج ہندوستان میں ان کی حق گوئی اور بےباکی قابل داد و ستائش ہے۔

(مرتب انتخاب)

مجی

سلام مسنون۔ دوسری قسط بھی ترجمہ کی پہنچی۔ ترجمہ کی خوبی مستغنی عن الوصف ہے۔ آپ مجھے تحریر فرمائیے کہ آپ کس شغل میں ہیں۔ اور آپ کی اسکیم کیا ہے۔؟ میرے اشتہار پر جن لوگوں نے درخواستیں بھیجیں۔ ان میں سے میں نے ہاشمی کو بلایا ہے ابھی تک وہ نہیں آئے۔ فرض کیجئے وہ نہ آئیں۔ تو کیا چار پانچ مہینہ کے لئے آپ شاعت میں مستقل تعلق نہیں رکھ سکتے۔ اصل یہ ہے۔ کہ پہلی جلد میں اب انگریزی اقتباسات کی جو جگہیں خالی ہیں۔ ان کے بغیر کام رکا پڑا ہے۔ آپ صرف مترجم نہیں۔ بلکہ مصنف بھی ہیں۔ اس لئے آپ کے سوا کوئی اور شخص مشکل سے میرے ارادوں اور خواہشوں کے موافق کام کر سکے گا۔ بہرحال جو فیصلہ ہو۔ مطلع کیجئے گا۔

ترجمہ میں آنحضرت کے متعلق واحد کی ضمیر نہ استعمال کیجئے۔ بلکہ جمع کی۔

میں اپنی مستقل قیام گاہ کا فیصلہ ابھی نہ کر سکا۔ ممکن ہے۔ کہ پیری اور ضعف کی بدہمتی مجھ کو وطن کی پابندی اور

"بہ شہر خود روم و شہر یار خود باشم"

پر آمادہ کرے۔ وہاں مکان ہے۔ رعایا ہے۔ احباب ہیں عزیز ہیں۔ غرض ایثار کے سوا سب کچھ ہے۔

پولیٹیکل معاملات میں جو طوائف الملوکی پیدا ہو گئی ہے۔ سخت قابل نفرت ہے۔ وزیر حسن امیر علی کا کیا مقابلہ ہے۔ قوم حقیقت میں سر سید مرحوم کے وقت میں بھی اندھی تھی اور اب بھی ہے۔

شبلی
۱۵ر نومبر ۱۹۱۳ء

مجی

خط پہنچا۔ سید کرامت حسین کی کتاب مولوی ابوالکلام مجھ سے لے گئے۔ کہ وہ خود ریویو لکھ دیں گے۔

حیدرآباد کی نسبت آپ کا خیال صحیح نہیں۔ مولوی سید حسین صاحب کی نسبت یہ خیال کہ بحیثیت پریسیڈنٹ انجمن اردو آپ کی کتاب پڑھ چکے ہوں گے عجیب حسن ظن ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے مشاہیر مصنفین کی کتابوں کے بھی دو ہی ایک صفحے پڑھے ہوں گے۔ اس کے علاوہ بڑی چیز وہاں شہرت ہے۔ جب تک کوئی شخص عام شہرت نہ پیدا کر لے۔ لوگوں کو خود حضور نظام سے سفارش کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ اس کے لئے ابھی دیر ہے۔ اور نہ اس کی کوئی مثال موجود ہے۔ میرے لئے جب مولوی صاحب موصوف نے سفارش کی تھی۔ تو حضور نظام نے خود جواب میں لکھا تھا۔ کہ مجھ کو خوشی ہوئی کہ ایسے شخص کے لئے آپ نے سفارش کی۔ اور میں ان کی سب تصنیفات اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ بہرحال اس کی امید سردست نہیں ہو سکتی۔ فلسفہ کے باب میں میری سفارش تحسین ناشناس ہو گی۔ البتہ اگر مولوی عبدالحق ان کو خوب یقین دلا دیں۔ تو شاید کوئی صورت ہو سکے۔

آپ نے مذہب پر آج ایک ٹکڑا بھیجا۔ لیکن ابھی تو ذاتی زندگی کا مضمون قرآن باقی ہے۔ وہ پورا کر بھیجئے۔ میں نے اور عنوانات جو پہلے لکھے تھے۔ ان کا بھی خیال رکھیے۔ مولویوں نے میرے کفر کے فتوے چار پانچ لکھ کر بھوپال بھجوائے ہیں اور اشاعت کفر میں [illegible] ندوہ سے کام لیا جا رہا ہے۔ آفتاب احمد خان اور علیگڑھ کی سخت پارٹی اصلاح ندوہ کی مخالفت اور حالات موجودہ کی حمایت پر جان لڑا دینے کے لئے آمادہ ہے یہ ہے ہمارا خلوص۔ خیر زمانہ گو حقیقت شناس نہیں ہے۔ تاہم سچ ہمیشہ نقاب میں نہیں رہے گا۔

شبلی نعمانی
۱۱ر جون ۱۹۱۱ء بمبئی

باکمال سید عبدالحکیم صاحب دسنوی کے نام

مولانا کے حلقہ احباب و معتقدین میں ہیں۔ دسنہ ضلع پٹنہ وطن ہے۔ قومی کاموں سے بے انتہا دلچسپی لیتے ہیں۔ مولانا کی تمام تحریکوں میں سب سے پہلے حصہ لیتے تھے۔ اخبارات میں ان کی تائید میں مضامین لکھتے تھے۔

جناب من۔

سلام مسنون۔ کارڈ پہنچا۔ مشکور فرمایا۔ لکھنؤ میں جو پارٹی میری مخالف پہلے سے تھی اس نے موقع پا کر اس قصہ کو طول دیا اور ایک جتھا بنا لیا ہے۔ جو مختلف اخباروں میں مضامین لکھتا ہے۔ یہ ایک باقاعدہ اور مسلسل کوشش ہے۔ جو ...... وغیرہ کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ حیرت یہ ہے۔ کہ میں نے اس معاملہ کو گورنمنٹ تک پہنچانے میں مطلق حصہ نہیں لیا۔ البتہ جب سب نے ہی کہا تو میں نے بھی اتفاق کیا۔ اس پر یہ حال ہے۔ کہ آپ

رنگ میں۔ نفاق کا یہ حال کہ پبلک میں آپنی علیحدگی دکھاتے ہیں۔ اور گورنمنٹ آفیسرس سے مل کر تمام کام انجام دیئے۔ مجھ کو خبر تک نہیں ہونے پائی۔ حکام سے ملنا۔ خط و کتابت کرنا۔ چھ مہینے کی معطل کا ممبروں سے منظور کرانا۔ مجھ کو ذرہ بھر اس سے تعلق نہیں۔

سیرۃ النبی کے متعلق روحانیات سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اگر اخلاق اور تقدس نفس مراد ہے۔ تو یہ لازمۂ نبوت ہے۔ بلکہ نبوت اس کا نام ہے اس میں کیونکر کوئی شخص کمی کر سکتا ہے۔ اور اگر اور کچھ مراد ہے۔ تو تحریر فرمایئے آج کل کے ریاکاروں نے دوسروں سے بدگمان کرنے کے لئے بہت سے الفاظ تراشے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کہ فلاں شخص میں روحانیت نہیں ہے فلاں شخص عالم ہے۔ لیکن دین دار نہیں۔ لیکن انہیں دین داروں کو مہینوں دیکھا ہے۔ کہ نماز فجر کبھی نصیب نہیں ہوئی باوجود اس کے ان کی دین داری اور روحانیت میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا۔

یقین فرمایئے زمانہ کی ریاکاری دیکھ کر دنیا میں زندگی وبال معلوم ہوتی ہے خواص تک عوام بن گئے ہیں۔ حق و باطل کی تمیز کا مادہ مسلوب ہو گیا ہے۔ مدینہ یونیورسٹی کے نصاب پر جو کچھ یہ حضرات لکھ رہے ہیں۔ کیا سچائی پر مبنی ہے۔ صرف یہ کاوش ہے کہ ان کا نام کیوں نہیں لیا گیا۔ قرآن شریف پر نقطے حجاج بن یوسف نے لگائے۔ اور کسی نے یہ تک نہ کہا۔ کہ حجاج پر قوم کو بھروسہ نہیں۔ بلکہ وہی منقط قرآن آج تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ موجودہ عمارت کعبہ بھی حجاج کی ہے۔

بلاغت کا پورا فن جس سے قرآن مجید میں ہر جگہ کام لیا جاتا ہے، حافظ عبدالقادر جرجانی، سکاکی، کا بنایا ہوا ہے۔ یہ سب معتزلی تھے۔ کسی نے نہیں کہا کہ ان پر قوم کو اعتماد نہیں، تفسیر کشاف تمام محدثین تک پڑھتے تھے۔ حالاں کہ اس میں اعتزال بھرا ہوا ہے۔

قوم میں جب تک نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے۔ تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتی۔ اس کو خود بھروسہ ہوتا ہے۔ کہ وہ خود انصاف کرے گی۔ جب علم نہیں رہتا اور حسد اور رشک کے سوا اور کوئی جوہر نہیں موجود ہوتا۔ تو لوگ اس قسم کی باتیں کہہ کر اپنا دل خوش کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو بدگمان بناتے ہیں۔

ارباب دیوبند نہایت زاہد اور متقشف ہیں۔ اس کے ساتھ وسیع النظر بھی نہیں ہیں۔ تاہم چوں کہ مخلص ہیں۔ اس لئے شور و شر نہیں مچاتے۔ کوئی پوچھتا ہے۔ تو رہ جاتے ہیں۔ بتا دیتے ہیں۔

غرض یہ قصہ طویل ہے۔ میں اب تک لکھنے سے بھی عاجز ہوں جوش میں آکر کیا کیا لکھ گیا۔ یغفر اللہ لی۔ شبلی

۱۹ر مئی ۱۹۱۲ء بمبئی

چودھری سید نظیر الحسن صاحب رضوی کے نام

مہابن ضلع متھرا کے علم دوست رئیس ہیں۔ موازنہ انیس و دبیر کا انہوں نے جواب لکھا ہے۔ مصنف نے طرز تحریر مباحث ترتیب ہر چیز میں مولانا کا تتبع کیا ہے۔ اور وہ تمام خصوصیات جو مولانا نے میر صاحب کے کلام میں دکھائیں وہ مصنف نے میرزا صاحب کے کلام میں دکھائی ہیں۔ اس کے جواب کا نام المیزان ہے)

مکرمی!

تسلیم۔ آپ کی قدردانی کا مشکور ہوں۔ آپ حضرت امام حسن علیہ السلام کے حالات مبارک لکھ رہے ہیں۔ بہتر اور باعث اجر ہے۔ لیکن پہلے جناب امیر کا درجہ تھا۔ امام حسن علیہ السلام کے حالات کم ملیں گے۔ اور خلافت تو کل چھ مہینے کی ہے۔

جناب امیر رضی اللہ عنہ کی عمدہ سوانح عمری کی سخت ضرورت ہے۔ نہایت ناتمام کتابیں اب تک لکھی گئیں۔ عربی میں کوئی جامع تصنیف نہیں۔ ان کے غزوات اور محاربات کے علاوہ ان کے علمی کارنامے بہت ہیں۔ اگر آپ عربی سے خوب واقف ہیں، تو میں بہت مدد دے سکتا ہوں اکثر اہل سنت ان کے بہت سے فضائل سے بے خبر ہیں۔ اکثر خواص میں یہ بھی خیال پھیلا ہوا ہے کہ جناب موصوف کے اصول سیاسی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کو بھی رفع کرتا ہے۔ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارہ میں سنی اور حضرت امیرؓ کے بارے میں شیعہ ہوں۔

شبلی

۱۰ر جولائی ۱۹۱۴ء

مولوی ظفر علی خان ایڈیٹر زمیندار کے نام

پنجاب کے مشہور قائد اور اخبار نویس جنہوں نے چالیس سال انگریز سے ٹکر لیکر قید و بند کی سختیاں جھیلیں۔ اور ضبطیوں اور قرقیوں کے بڑے بڑے ہمت شکن مالی نقصانات برداشت کئے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی بیداری اور اسلام دوستی میں انہوں نے رہنمایانہ حصہ لیا۔ ملت اسلامیہ کے مفاد کی ہندوستان میں ہمیشہ حفاظت کی۔ وہ ممالک اسلامیہ کے درمیان اتحاد کے علم بردار تھے۔ شعر خوب۔ دلآویز کہتے تھے۔ اور ندرت قوافی میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ شبلی مرحوم کے علیگڑھ کے شاگردوں میں سے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی۔ ملت اسلامیہ ہندیہ کی جماعت نو ان کی قربانیوں کی مرہون منت ہے۔

(مولف انتخاب)

عزیزی مولوی ظفر علی خانصاحب دام قدرہٗ

السلام علیکم۔ میں نے جو فتویٰ لکھا۔ اس سے علماء فرنگی محل بھی متفق ہیں۔ اور مولوی عبدالباری صاحب کا خط بھی شائع ہو چکا ہے۔ ہدایہ میں اس کا جزئیہ موجود ہے البتہ ہدایہ میں صرف جائز ہے۔ اور میں نے افضلیت کا فتویٰ دیا ہے۔ اس قدر میرا اجتہاد ہے۔

بھائی! ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے، اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں۔ آپ کہتے ہیں، کہ سنت ابراہیمی موقوف نہ ہو۔ ہاں وہی سنت مقصود ہے۔ فرق یہ ہے۔ کہ آپ اس سنت کو لیتے ہیں۔ جس کا مینڈھے پر عمل ہوا اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں۔ جو اسماعیل علیہ السلام پر مقصود تھی۔ کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے؟ یہاں کے جلسے میں، میں نے چند شعر پڑھے تھے مناسبت موقع سے چند شعر درج کرتا ہوں۔

مراکش جاچکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک
بکھرتا جاتا ہے شیرازہ اوراق اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک

حریفوں کو گلا ہے آسماں سے تنگ سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں گے ان کی کھیتیاں کب تک

حرم کے سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کا آشیاں کب تک
جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلیؔ اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیروان کب تک

شبلی
لکھنؤ - ۱۰ر نومبر ۱۹۱۲ء

جرائد اسلامیہ کے نام

جناب من ! بعض صاحبوں کا خیال ہے۔ کہ ترکوں کی ہمدردی میں اگر قربانی کے بجائے قیمت دی گئی۔ تو اس سے احتمال ہوگا کہ قربانی خود غیر ضروری ہے۔

لیکن یہ صحیح نہیں۔ شریعت میں فرائض کے درجات میں بھی ترتیب ہے اور وقتی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ غزوۂ خندق میں جہاد میں معروف ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلعم کی نمازِ عصر قضا ہو گئی۔ تو کیا تعجب ہو سکتی ہے کہ نماز کا قضا کرنا جائز ہے؟

ترکوں کی اعانت اس وقت فرضِ عین ہے۔ اس لئے اس خاص موقع اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا۔ تو اس سے آئندہ کے لئے کیا حجت ہو سکتی ہے۔ قربانی شعارِ اسلام ہے۔ مسلمان اس کو نہیں چھوڑ سکتے۔ نہ کوئی قوم ان کو اس پر مجبور کر سکتی ہے۔ نہ وہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی پروا کر سکتے ہیں۔

امید ہے کہ میرا خط اور صاحبانِ اخبار بھی اپنے پرچوں میں نقل کر دیں گے۔

شبلی
۱۷ر نومبر ۱۹۱۲ء

مولوی حمید الدین صاحب کے نام

برادرم - !
مفصل شانِ نزول سن کر جواب لکھو -!

ترجمہ کا خیال امیر عبد الرحمان والی کابل کو پیدا ہوا ہے۔ اور بڑے وسیع پیمانہ پر۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے سفیر ہندوستان کو لکھا۔ اور سفیر نے مجھ کو و مولوی حالی صاحب و نذیر احمد کو، میں نے پہلے انکار کیا۔ پھر یہاں کے تمام اعزہ و احباب کے اصرار پر رضامندی ظاہر کی۔ سفیر صاحب نے یہ معلوم کرا کے کل ترجمہ اور اس کا تمام اہتمام میرے ذمے کر دیا۔ اور دس ہزار کی رقم منظور کی جو بہ تفاریق لی جائے خواہ یکمشت۔

ابن خلدون کا ترجمہ تم بے شبہ خود کر سکتے ہو۔ لیکن اس میں تاریخی تلمیحات اور اجمال اور حوالے اس قدر ہیں۔ کہ میں اچھی طرح اندازہ کرتا ہوں۔ کہ ابتدائی جلدوں میں تم کو دقت پیش آئے گی۔ کتاب مذکور کے سات ہزار صفحے ہیں۔ اور وہ بھی ٹائپ کے در اگورو خط میں۔ میں نے تین برس کا وعدہ کیا ہے۔ اب چند باتیں بطورِ تذکرہ کے سنو۔

(۱) مستقل تمہارے نام سے ترجمہ ہونے پر سفیر راضی نہیں ہو سکتے۔ بلکہ میرا انتساب بھی ضروری ہے۔

(۲) کتاب اس قدر ضخیم ہے۔ کہ وہ ایک برس مستقل اشتغال کے بغیر اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔

(۳) بہت سے ضروری مشوروں کے لئے میری قربت ضرور ہے۔

(۴) تم اپنا قائم مقام کسی ہندوستانی شخص کو پوری تنخواہ پر کر سکتے ہیں۔

(۵) صرف ابتدائی کام اور خاکہ قائم ہونے تک تمہارا یہاں رہنا درکار ہے پھر جہاں چاہو رہ سکتے ہو۔

(۶) یہ کام شہرت اور عزت کا ذریعہ ہے۔ اور آگے راہیں نکلیں گی۔ کیونکہ گورنمنٹ انگریزی کی سرپرستی میں یہ کام ہوگا۔

(۷) مگر یہ کہ کام کرو گے۔ تو تمہارا خرچ مختصر ہوگا۔ اور تم کو کم از کم ۵۰ کی بچت ہو گی۔

امیر صاحب انگریزی کتابوں کے ترجمہ کا بھی محکمہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چار انگریز اور سولہ ہندوستانی مترجم ملازم ہوں گے محکمہ کا صدر مقام کلکتہ ہوگا۔ اس محکمہ کا سیکرٹری مجھ کو مقرر کرتے ہیں۔ لیکن میں نے انکار لکھ بھیجا اور زیادہ تر امید ہے کہ اگر تمہارے لئے مناسب تحریک کر دوں گا۔ تو تم کو یہ عہدہ مل جائے گا۔ اس صورت میں اتنے بڑے وسیع کام کا تمہاری ماتحتی میں انجام پانا بہت سے فوائد کا مثمر ہوگا۔ اب اپنی رائے لکھو۔

شبلی نعمانی
۲۹ر جولائی ۱۹۰۰ء

برادرم

بھائی اچھا ہوتا گیا۔ ولن یصلح العطار ما افسد الدھر دو دن اچھا رہا۔ تو چار دن بیمار رہتا ہوں۔ لیکن بات چیت کرتا رہتا ہوں۔ لوگ جانتے ہیں، کہ کوئی شکایت نہیں۔ لیکن جسم برہم ہو چکا۔ ابھی ابھی سخت سردی لگی۔ حالاں کہ دوپہر کا وقت ہے۔

افسوس یہ ہے۔ کہ سیرت پوری نہ ہو سکی۔ اور کوئی نظر نہیں آتا۔ کہ اس کام کو پورا کر سکے۔

وقف نامہ میں اشامپ کا جھگڑا تھا۔ اس لئے کلکٹر کے یہاں درخواست دے دی، وہ طے کر دیں۔ تو تکمیل ہو جائے۔ تو تم کو متولیوں میں رکھا ہے۔ اور اگر دار المصنفین قائم ہوا تو تمہارے سوا کون چلائے گا۔

الہ آباد کا معاملہ امید ہے کہ طے ہو جائے۔ دس ہزار پر خاتمہ ٹھیرا۔ دستاویز لکھ دی گئی، رجسٹری باقی ہے۔ آج سید سلیمان ندوی آرہے گے۔ اور کل پرسوں چند طلبہ۔ ہمیں لیکن بیماری سب منصوبے غلط کر رہی ہے۔ سید سلیمان یوں ہی ملنے کو آتے ہیں

ماموں صاحب کا کتب خانہ یہاں آگیا، قلمی کتابیں اکثر برباد ہو گئیں۔ اور کچھ مطبوعہ بھی۔ تقریباً سو کتابوں کی جلد بنوائی ہے۔

شبلی
۱۰ر اکتوبر ۱۹۱۴ء اعظم گڑھ

سید سلیمان کے نام

عزیزی۔

تم نے اپنی حالت کے متعلق حجابانہ طریقہ میں اظہار خواہش کیا ہے۔ عزیزی۔ کیا اس کے کہنے کی حاجت ہے۔ تم ہر وقت میری آنکھوں میں ہو اور میں موقع ڈھونڈتا رہتا ہوں۔ لیکن اتنی جلد کون کامیاب ہوتا ہے۔ میاں حمید اس لیاقت پر جو زمانہ کے موافق بھی تھی۔ کتنے دنوں کے بعد ٹھکانے لگے خود میرا کیا ہوا۔ عمادی

کس حالت میں ہیں۔ سب سے پہلا موقعہ جو ملے گا۔ میں تم کو پیش کروں گا۔ بھوپال میں تو علم کی کوڑی برابر قدر نہیں۔ حیدرآباد میں شاید کوئی صورت نکلے۔ لیکن ابھی تم کو شہرت کے عام منظر پر زیادہ نمایاں ہو کر آنا چاہیے۔ الہلال بھی ایک ذریعہ ہے۔ اور میں تو ہر جگہ تمہاری حمایت کرتا ہی رہتا ہوں۔ میں خود منتظر ہوں۔ کہ موجودہ حالت میں بھی تم کو کیوں کر زیادہ مالی فائدہ پہنچاؤں

والسلام

شبلی

۱۳ر فروری ۱۹۰۸ء

مولوی مسعود علی صاحب ندوی کے نام

عزیزی۔ سلام ودعا۔

خط پہنچا۔ تمہارے دواعی جلسے کا حال پہلے خط سے معلوم ہوا تھا۔ میں ایک نہایت ضروری لیکن پُرکیف خدمت میں مصروف ہوں۔ ”سیرۃ نبوی“ وہ جس قدر زیادہ ختم کے قریب آتی جاتی ہے۔ ذوق بڑھتا جاتا ہے۔ اس لیے اکثر یہ ارادہ ہوتا ہے۔ کہ پہلی جلد تمام کر کے یہاں سے نکلوں۔ وہاں یہ یکسوئی کہاں۔ لیکن بظاہر پہلے آنا پڑے گا اس غرض سے کہ بعض امور میں میاں حمید سے مشورہ رہ سکے۔

ندوہ سے تعلق منقطع ہونا محال ہے۔ لیکن یہ وہاں اگر فیصلہ ہو سکتا ہے۔ کہ تعلق کی نوعیت کیا ہو۔ لوگ تو لکھتے ہیں۔ کہ ابھی سے حالت بالکل بدل گئی ہے درحقیقت اب وہ محض لونڈوں کا مکتب رہ جائے گا۔

تمہارے اشتغال کی نسبت وہیں اگر فیصلہ ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ باتیں خط و کتابت سے انجام نہیں پا سکتیں۔ دیر تک بالمشافہ تبادلِ خیالات رہنا چاہیے۔

حالت موجودہ کا افسوس ضرور ہے۔ لیکن ہم کو اس پیر مغرب سے یہ سیکھنا چاہیے کہ اس نے دس برس متواتر کوشش میں کبھی ناکامی سے ہمت نہیں ہاری۔ پبلک کی قوت ملک میں بڑھتی جائے گی۔ اس سے کام لینا چاہیے۔ چند سازشی آدمی مفت میں ایک بڑے قومی کارخانہ کو دبا بیٹھیں۔ اس کو قوم کیوں کر دیکھ سکے گی۔ لیکن قوم کے متوجہ کرنے کی تدبیریں کرنی چاہییں۔

تم علمی آدمی ہو۔ اس لیے قومی اشتغال میں اہل قلم سے تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔

شبلی

۱۴ر اگست ۱۹۱۲ء

مولوی عبدالسلام (مولانا کے شاگرد عزیز تھے)

بھائی۔ تم ناراض ہو گئے۔ البشیر وغیرہ کا مجھ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ ہمدرد یا کسی نے تمہارے متعلق ایک حرف بھی نہیں کہا۔ یہ خبر بھی تمہیں نے دی۔ میری غرض تو صرف اس قدر تھی۔ کہ تم کام بھی کرتے جاؤ۔

تم کہتے ہو کہ اپنے بدخواہوں کی مبالغہ آمیز سفارش کرتا ہوں۔ بھائی! تم سے بڑھ کر کون بدخواہ ہوگا۔ کہ باوجود میرے منع کرنے کے تم نے مسلسل مضامین دے چھوڑے۔

مولوی ابوالکلام یہاں نہیں ہیں۔ لیکن تمہارے بہت طالب ہیں۔ اور مجھ سے وعدہ لیا ہے۔ کہ الہلال میں جانے کی اجازت دوں گا۔

اور الہلال میں جاؤ تو ناراض ہو کر کیوں جاؤ۔

تم میری وجہ سے یا میں تمہاری وجہ سے بدنام ہو چکے پھر آپس میں جدائی ہو کیسی افسوس کی بات ہے۔

شبلی

دہلی۔ ۱۳ر اپریل ۱۹۱۳ء

ہمدم مدیر مولوی عبدالباری صاحب کے نام

عزیزی!

سلام ودعا۔ خط ملا۔ کشمیر کیا آؤں۔ اب بمبئی کے قابل بھی نہیں رہا۔ یعنی دن بھر دروازے بند رکھتا ہوں۔ ہوا ذرہ خشک ہو گئی ہے تو اس کی برداشت نہیں ہو سکتی۔ ایک مرتبہ صرف اس بے احتیاطی سے بخار آ چکا۔ بھائی تیل تمام ہو چکا۔ بجز اب مجھ میں کچھ نہیں رہا۔ غذا ۲۴ گھنٹوں میں سب ملا کر پاؤ بھر۔ بات کرنا گراں ہوتا ہے۔ حالانکہ بخار وغیرہ کی کچھ شکایت نہیں۔

میرے خلاف اس قدر طوفان برپا رہا۔ لیکن لکھنے کی طاقت نہ تھی۔ اور اب تک کوئی مفصل تحریر نہ لکھ سکا۔ گو بہت دنوں سے جانتا ہوں۔ ان کا سفلہ پن تو ہمیشہ سے معلوم ہے۔ لیکن اس قدر بدنفسی کا خیال نہ تھا۔ سخت حیرت یہ ہے کہ اب تک میری طرف سے ان کی نسبت کوئی بات وجود میں نہیں آئی۔ میں نے کسی کی شکایت تک نہیں کی۔

ابتدا یوں ہوئی کہ ..... وغیرہ نے ان کو یقین دلا دیا۔ کہ اس سے آپ کی آزادگوئی ثابت ہوگی۔ اس بھٹی میں وہ آ گئے۔ اور پھر یہ لوگ اسے بڑھاتے گئے یا شاید کوئی اور وجہ ہو۔ بھائی بات یہ ہے کہ۔

خاطر یک دو کس ارشاد شود از تو بس است
زندگانی بہ مراد ہمہ کس نتواں کرد!

یہاں بعض عمدہ کتابیں ہاتھ آئیں۔ انساب سمعانی نہایت نایاب اور ضخیم کتاب یورپ نے فوٹو میں چھاپی۔ جامع مسجد کے کتب خانہ میں شعرانی کی کتاب محاسن الشریعہ کا قلمی نسخہ ہے۔ جو نایاب ہے۔

سیرت ہوئی جاتی ہے۔ غزوات پر ریویو لکھ رہا ہوں۔ افسوس سید سلیمان کو آزاد نے چھین لیا۔ عبدالسلام اچھے ہیں۔ لیکن لا یغنی مغناہ۔

بھائی! میں تو اب چراغ سحر ہو رہا ہوں۔ تم اپنی ذمے داری کو محسوس کرو۔ میں اپنے عیوب کو سب سے بہتر جانتا ہوں۔ المرء، عرفت بنفسہ لیکن علمی مذاق کا پھیلانا اپنا کام سمجھتا رہا۔ اگر اس میں ذرہ بھی کامیابی ہوئی ہو۔ تو مسلم گزٹ کے مصنوعی خطاب کے قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ سخت افسوس یہ ہے۔ کہ ہر حیثیت سے زمانہ میں خرابازاری بڑھ گئی ہے۔ نیک و بد کی تمیز مطلق نہیں۔ ابھی آغاخان، علی محمد خاں، محمد علی کو آسمان پر چڑھایا۔ ابھی اوپر سے زمین پر دے پٹکا۔ اپنی گرہ کی عقل نہیں۔ مسلم گزٹ کی ہر تحریر کو ایک لونڈا پڑھ کر سمجھ سکتا ہے۔ کہ معاندانہ اور یک طرفہ ہے۔ لیکن سیکڑوں احمق اس کی حریت کے قائل ہیں۔

ایک نظم الہلال میں اپنے نام سے بھیج دی ہے۔ زیادہ پُرجوش ہے۔ لوگ اور گھبرائیں گے۔

مدینہ یونیورسٹی کی تجویز میں قسطنطنیہ کو لکھنؤ سے توارد ہوا۔ خیر۔ لیکن بہت ضروری چیز ہے۔ افسوس ہے۔ کہ اب ہمت نہیں۔ کہ اس کے متعلق کچھ کر سکوں۔ پہلی سی بات ہو؟

تو مدینہ جانا کیا مشکل تھا۔

شبلی

بمبئی - ۱۵ جون ۱۹۱۳ء

ایم مہدی حسن کے نام

پایہ نوازی من۔ مدت ہوئی البشیر میں "قاموس الاسلام" کے عنوان سے ایک مضمون دیکھا، نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے۔ حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرتاپوری دوست ہیں، یا نذیر احمد یا آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن تک دیکھتا اور احباب کو دکھلاتا رہا۔

دو تین ہفتہ ہوئے وہی برق ایک اور افق پر چمکی۔ لیکن اس سے زیادہ ہوش ربا اور فسوں گن تھی، مصمم ارادہ ہوا، کہ آپ کی ضرور مبارکباد لکھوں۔ لیکن حیدرآباد کی مصائب آمیز زندگی کسی دلی جوش کے اظہار کا موقع کہاں دیتی ہے۔ غرض وہ چوٹ زخم کا پور بنکر دل میں رہ گئی۔ آج آپ کا بھیجا ہوا البشیر پہنچا۔ اور وہ چوٹ ابھر آئی۔ زیادہ کیا لکھوں۔ خدا آپ کو آپ کے دست و قلم کو آپ کی صنعت گری طبع کو قائم رکھے۔ بخدا مجھ کو خوشی سے زیادہ آپ پر رشک ہوتا ہے۔ کبھی کبھی خط بھی لکھئے۔

میں الغزالی لکھ چکا۔ اور مطبع میں جا چکی۔ علم کلام کی تاریخ بھی ختم ہو چکی۔ اب جدید علم کلام پر لکھ رہا ہوں۔ یہ دونوں حصے ساتھ چھپیں گے۔ اگر یہاں اطمینان سے رہنا پیش آتا۔ تو بڑے بڑے کام انجام پاتے۔ لیکن ہر وقت رکاب میں پاؤں ہے۔ جو گھڑی مل جاتی ہے اسی پر جرأت ہے۔ مولوی سید علی صاحب پرسوں میرے پاس تشریف لائے تھے ۲۷ مارچ کو ولایت جاتے ہیں۔

دوستاں رفتند و من ہم میروم

والسلام

شبلی

حیدرآباد - ۱۰ ؍ مارچ ۱۹۰۱ء

معرکۂ مذہب و سائنس (مصنفہ ڈریپر)

مترجمہ

مسٹر ظفر علی خان بی، اے،

پر

ریویو

اردو زبان کم رتبہ تصنیفات اور تراجم سے جس طرح روز بروز معمور ہوتی جاتی ہے۔ اس کے لحاظ سے اگرچہ اہل نظر پر مایوسی چھا گئی ہے۔ لیکن مدتوں میں ایک آدھ تصنیف یا ترجمہ ایسا بھی نکل آتا ہے۔ جو مایوسی کی تاریکی میں امید کی جھلک پیدا کر دیتا ہے۔ زیر ریویو بھی اسی قسم کا ایک ترجمہ ہے۔

ڈاکٹر ڈریپر امریکہ کا مشہور عالم ہے۔ وہ نیویارک یونیورسٹی کا پروفیسر تھا، اس کی ابتدائی بہت سی تصنیفات علم الضوء اور کیمیا پر ہیں، وہ ان فنون میں بہت سے اختراعات کا موجد ہے، چنانچہ مترجم صاحب نے اپنے دیباچہ میں بہ تفصیل لکھا ہے، اس سلسلہ سے الگ اس نے یورپ کی دماغی ترقی کی تاریخ لکھی، جو ایک گراں قدر تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ اور تصنیف زیر ریویو اس کے دور آخر کی تصنیف ہے۔

مترجم صاحب مشہور مترجم ہیں۔ ان کی کتاب خیابان فارس سنداول ہو چکی ہے، دکن ریویو نے بھی ان کو کچھ کم روشناس نہیں کیا ہے۔ ترجمہ کی خوبی پر میں کچھ رائے نہیں دے سکتا، کیونکہ میں انگریزی نہیں جانتا، اس لئے ترجمہ کی صحت اور غلطی کا فیصلہ نہیں کر سکتا، البتہ اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ کسی علمی کتاب کا صحیح ترجمہ اس سے زیادہ صاف اور قریب الفہم نہیں ہو سکتا، مترجم نے مصطلحات علمی کے ترجمہ میں بہت سے الفاظ گو خود پیدا کئے ہیں۔ چنانچہ خاتمہ میں ایسے الفاظ کی جو فہرست دی ہے۔ اس میں بہت سے الفاظ ہم کو جدید النشاۃ نظر آتے ہیں۔ مثلاً اسد کہکشانی، نباتات خوار، دور ثالثۃ الوسطی، ذو لاب قندیل، توتیم، جماعت اکثرین، تقدیس الاموات وغیرہ وغیرہ،

مترجم صاحب اگرچہ بہت متین لکھنے والے ہیں، لیکن کہیں کہیں سخیف محاورے آگئے ہیں جو ایک علمی کتاب کے شایان نہیں، مثلاً دُم دبا کر بھاگ نکلے، پر چڑھا کر ہو وغیرہ وغیرہ،

مترجم کا یہ خاص احسان ہے کہ مصنف نے جہاں کوئی بات اسلام کے خلاف لکھی ہے انہوں نے نوٹ میں اچھی طرح اس کی پردہ دری کی ہے۔ اور اس وقت وہ مترجم نہیں بلکہ اچھے خاصے تند مزاج مولوی ہیں۔

کتاب کا موضوع نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے۔ یعنی یہ کہ دنیا میں مذہب اور تحقیقات علمی کا باہمی تعلق کیا رہا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں معرکہ آرا رہے ہیں، مذہب نے کس طرح علم پر بے انتہا جور و ظلم کئے ہیں، اور بالآخر کس طرح ہر معرکہ میں شکست فاش کھائی ہے۔ لیکن اس کتاب کے متعلق سب باتوں سے پہلے یہ کہنا پڑتا ہے کہ مصنف نے یہ سخت غلطی کی ہے کہ کتاب کا موضوع عام رکھا ہے اور بحث صرف عیسوی مذہب سے کی ہے، اس لئے اگر عیسوی مذہب نے علم پر زیادتیاں کیں اور بالآخر شکست کھائی تو اس سے عام مذہب کے نسبت کوئی نتیجہ کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے اس امر پر ہم آئندہ مفصل گفتگو کریں گے،

اس کتاب پر ہم مختلف حیثیتوں سے بحث کرتے ہیں،

موضوع کتاب یورپ کے ایک مشہور مصنف سے نہایت تعجب ہے کہ وہ ایک ایسا وسیع مضمون اختیار کرتا ہے جس کے دائرہ میں تمام دنیا کے مذاہب اور قومیں داخل ہیں، لیکن صرف عیسائی قوموں اور عیسائی مذہب کی تاریخ سے بحث کرتا ہے۔ اور انہیں قوموں کے واقعات پیش کرتا ہے، مسلمانوں کی علمی اور ملکی تاریخ لکھی ہے، لیکن اس غلط بنا پر کہ مذہب اسلام نصرانیت کی ایک شاخ ہے۔ اس موضوع کے پیش نظر ہونے کے ساتھ ہر شخص بیساختہ اس بات کے دریافت کرنے کا شائق ہو گا۔ کہ بدھ، برہمنی، چینی، پارسی مذاہب کا علم کیساتھ کیا طریق عمل رہا؟ دونوں حریفوں میں سے کس نے بازی جیتی؟ لیکن غالباً مصنف کے نزدیک دنیا صرف عیسائی دنیا کا نام ہے اس لئے اس کو دوسری قوموں اور دوسرے مذہبوں سے بحث کی ضرورت نہیں،

مصنف نے اس معرکہ کی تاریخ جس ترتیب سے بیان کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے، کہ

"چوتھی صدی قبل مسیح یونان نے ایران پر حملہ کیا، اور جدید معلومات سے بہرہ ور ہو کر اسکندریہ میں دارالعلم کی بنیاد ڈالی، رومی سلطنت نے عیسائی مذہب قبول کیا، اور کچھ مدت کے بعد جمہوریت، شخصیت سے بدل گئی، چونکہ اس رومی سلطنت کے تحت میں تمام بت پرست قومیں آگئیں اور ان کے معتقدات اور رسوم کا لحاظ رکھنا پڑا، اس لئے عیسائیت میں بت پرستی آ گئی، ساتھ ہی علم اور عیسائیت میں معرکہ آرائی شروع ہوئی، اور کتب خانہ اسکندریہ برباد ہو گیا۔"

جنوب میں اصلاح شروع ہوئی یعنی پادری نسطورا کی تلقین و ہدایت سے اسلام پیدا ہوا۔" (استغفر اللہ)

اس کے بعد مصنف نے ان اہم مسائل کو لیا ہے جن میں مذہب اور علم مختلف ہیں، اور الگ الگ عنوان کے تحت میں دکھلایا ہے۔ کہ ان مسائل میں کیونکر علم و مذہب باہم جنگ آزما ہے اور پھر کیونکر علم نے فتح حاصل کی۔ مسلمانوں کے تمام علمی کارناموں اور انکشافات کا ذکر کیا ہے۔ اور دکھایا ہے کہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ یورپ میں علم پھیلا۔ اور عیسائی مذہب کے بے ہودہ عقائد کا تمام طلسم ٹوٹ گیا۔ پہلے ہی دہلہ میں ہم کو مصنف کی اس رائے سے بحث کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ کہ اسلام کو نسطورا سے کہاں تک تعلق ہے، کیونکہ مصنف کے نزدیک علم کی فتح درحقیقت نسطورا کا فیض تھا جس نے گویا اسلام کی بنیاد رکھی، مصنف اس واقعہ کو ان الفاظ میں کہتا ہے،

"بحیرہ راہب نے بصرے کی خانقاہ میں محمدؐ کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی، اور اپنے مظالم کی داستان شروع سے آخر تک کہہ سنائی آپ کے نا تربیت یافتہ (استغفر اللہ) لیکن مستعد اور اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا نہایت گہرا اثر قبول کیا، بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی صاف شہادت ملتی ہے۔ کہ نسطوریوں کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا، آپ نے اپنی زندگی کو نسطوریوں کے دینی عقائد کی توسیع و اشاعت کے لئے وقف کر دیا۔ اور جب یہ مقصد پورا ہو چکا تو آپ کے جانشینوں نے ان کے علمی و سائنٹفک اصول اختیار کر لئے، اور نہایت سرگرمی سے ان کی اشاعت میں حصہ لیا۔"

سبحانک ھذا بہتان عظیم

اگرچہ ڈریپر صاحب کے مقابلہ میں صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ بحیرا کی ملاقات معتبر طریقے سے ثابت نہیں لیکن چونکہ یہ روایت عام عربی تاریخوں میں مذکور ہے، اس لئے ہم کسی قدر تفصیل سے اس کی نسبت بحث کرنا چاہتے ہیں،

یہ روایت جس حیثیت سے عربی کتابوں میں مذکور ہے۔ اس سے ڈریپر صاحب کے دعویٰ کو کچھ مدد نہیں مل سکتی۔ یہ روایت ترمذی، حاکم، بیہقی، ابونعیم، اور ابن عساکر نے روایت کی ہے، ترمذی کے الفاظ کا خلاصہ یہ ہے۔

"ابوطالب شام کے سفر کو چلے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور چند سرداران قریش ساتھ تھے، جب راہب (یعنی بحیرا) کے پاس آئے اور اسباب کھولنا شروع کیا تو راہب آیا اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر کہا یہ تمام عالم کا سردار اور خدا کا پیغمبر ہے۔ خدا نے اس کو دنیا کی رحمت کیلئے بھیجا ہے، سرداران قریش نے پوچھا۔ کہ تم کو کیونکر معلوم ہوا، اس نے کہا جب تم پہاڑ کی چوٹی سے اترے تو تمام پتھروں، درختوں نے سجدہ کیا اور پتھر اور درخت پیغمبر کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے، میں ان کو مہر نبوت کے ذریعہ سے پہچانتا ہوں، پھر اس نے خانقاہ میں جا کر کھانا تیار کیا، اور لوگوں کو بلایا۔ تو آنحضرت صلعم کے سر پر بادل سایہ کرتا آتا تھا آنحضرت صلعم درخت سے ہٹ کر بیٹھے، کیونکہ اور لوگوں نے پہلے سے پہنچ کر قبضہ کر لیا تھا، جب آپ بیٹھے تو درخت کا سایہ بڑھ کر آپ پر جھکا، راہب نے لوگوں سے کہا، دیکھو سایہ کیونکر ان پر جھکا آتا ہے، الخ۔ اخیر میں یہ ہے، کہ اس سفر میں حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ بھی تھے۔"[1]

یہی روایت طرح طرح کے پیرائے بدل کر، طبقات ابن سعد، تاریخ طبری، ابن ہشام وغیرہ میں منقول ہے۔ اس حدیث کی یہ کیفیت ہے کہ ترمذی نے اس کی نسبت لکھا ہے۔ کہ یہ حسن اور غریب ہے، اور صرف اسی طریقے سے منقول ہے۔ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں عبدالرحمان بن غزوان کے ذکر میں لکھا ہے کہ

مما یدل علی انہ باطل قولہ وبعث معہ ابوبکر بلالا وبلال لم یکن خلق وابوبکر کان صبیا	اس حدیث کے باطل ہونے کی یہ دلیل ہے کہ اس میں یہ بیان ہے۔ کہ حضرت ابوبکرؓ نے بلال کو آنحضرت صلعم کے ساتھ کر دیا، حالانکہ اس وقت بلالؓ تو پیدا نہیں ہوئے تھے، اور حضرت ابوبکرؓ بچے تھے۔

مستدرک نے حاکم کی تلخیص میں لکھا ہے۔

اظنہ موضوع ۔ بعضہ باطل	میں اس کو جعلی روایت سمجھتا ہوں کیونکہ اس کا کچھ ٹکڑا باطل ہے۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اخیر کا ٹکڑا ممکن ہے۔ کسی نے ملا دیا ہو، باقی حدیث اسلئے صحیح ہے۔ کہ راوی ثقہ ہیں، لیکن اصل بحث یہ ہے کہ سب سے اخیر راوی یعنی ابوموسیٰ اشعری خود واقعہ میں شریک نہیں تھے، اور یہ بیان نہیں کرتے کہ انہوں نے کس سے سنا، اس لئے یہ حدیث منقطع ہے، ممکن ہے کسی غیر معتبر شخص نے ان سے بیان کی ہو، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے واقعات جس قدر منقول ہیں، اکثر محدثین کے نزدیک غیر معتبر اور غیر مستند ہیں،

اب درایت کی حیثیت سے ڈریپر صاحب کے بیان پر نظر ڈالو۔ آنحضرت صلعم کی عمر اس وقت کل بارہ برس کی ہے۔ اسی سن میں بحیرا، آپ کو عقائد کے حقائق اور فلسفہ سکھاتا ہے۔ اور آپ کے دل میں نقش ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد پورے ۲۸ برس تک ان عقائد اور فلسفہ کے متعلق ایک حرف آپ کی زبان سے منقول نہیں، روایتوں سے اس قدر ثابت ہے کہ کفار آنحضرت صلعم کو طعنہ دیتے تھے کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں۔ اوروں سے سیکھ کر کہتے ہیں، لیکن یہ سکھانے والے (باعتقاد کفار) خود آنحضرت صلعم ہی کے زمانے کے لوگ تھے، یعنی سلمان فارسی وغیرہ، بحیرا کا نام کافروں نے کبھی نہیں لیا، تا بہ مسلمانان چہ رسد،

ڈریپر صاحب ان مستانہ مورخوں میں نہیں ہیں جو اسلام سے تعصب نہیں رکھتے، انہوں نے مسلمانوں کی علمی ایجادات اور انکشافات کا ذکر اس تفصیل سے کیا ہے کہ خود عربی تاریخوں میں کسی جگہ یکجا نہیں مل سکتا، لیکن افسوس ہے کہ صاحب موصوف کی نسبت ہماری احسان مندی اس وجہ سے کم ہو جاتی ہے کہ ان کی مہربانیاں اسلام پر اس لئے نہیں ہیں، کہ وہ اسلام ہے بلکہ اس لئے ہیں کہ وہ نسطوری مذہب کی ایک شاخ ہے مسلمانوں کے علوم و فنون ان ہی عقائد اصول کے نتائج ہیں، جو بحیرا نے تعلیم دئے تھے مسلمانوں کو اپنی خالص توحید پر بڑا ناز ہے۔ لیکن ڈریپر صاحب کے بتانے سے معلوم ہوا، کہ وہ بھی بحیرا کا فیض تعلیم ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

"راہب بحیرہ نامی نے کوشش کی کہ جس طرح ہو اس لڑکے (محمدؐ) کے دل سے اس بت پرستی کے اثر کو جو اس کا آبائی مذہب ہے، زائل کیا جائے،

---

[1] ۔ زرقانی شرح مواہب لدنیہ مطبوعہ ۱۲۹۱ھ مطبوعہ مصر جلد اوّل

بحیرو نے دیکھا کہ لڑکا نہایت ہوشیار اور غیر معمولی طور پر ذہین ہے، اور مذہبی باتوں کو نہایت شوق اور توجہ سے سنتا ہے" (نعوذ باللہ من ہذہ الھفوات)

ایک جگہ اور فرماتے ہیں،

"بحیرہ راہب کی تعلیم کا اثر تھا کہ آپ نے اس عجیب وغریب زندگی کے دوران میں جس کے کارناموں نے دنیا کو محو حیرت کر دیا، حضرت مسیح کو کبھی خدا کا بیٹا کہہ کر نہ پکارا۔"

اگر بت پرستی اور حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کا انکار دونوں چیزیں اسلام نے بحیرا سے سیکھیں، تو خود اسلام کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔

مصنف نے اسلامی فتوحات کے ذکر میں کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کا ذکر بھی کیا ہے، اور وہاں اس طرح ان پر تعصب نے استیلا کیا ہے، کہ بظاہر ان کا کلام خود متناقض ہو گیا ہے، چنانچہ مترجم صاحب نے نوٹ میں اس پر تعجب ظاہر کیا ہے، لیکن حقیقت میں ان کے بیان میں تناقض نہیں،

مصنف نے حسب ذیل دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ کتب خانہ مذکور کا جلایا جانا صحیح نہیں ہو سکتا،

(۱) اس کتب خانہ کو تھیا فلس نے پہلے ہی برباد کر دیا تھا، چنانچہ اس واقعہ کے بیس برس بعد اوروسیوس نے جب کتب خانہ کو دیکھا تو ایک کتاب بھی باقی نہ تھی،

(۲) اگر اس بربادی کے بعد کتب خانہ بچا بھی ہوگا تو بہت کم کتابیں بچی ہوں گی حالانکہ الزام لگانے والے کہتے ہیں، کہ پانچ لاکھ کتابیں تھیں، جو حضرت عمرؓ کے حکم سے جلائی گئیں۔

(۳) کتابیں اکثر جھلی پر لکھی ہوئی تھیں، اس لئے وہ حمام کے جلانے میں کام نہیں آسکتی تھیں، لیکن ان سب باتوں کے ساتھ کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جلائے جانے کا حکم ضرور دیا، مترجم نے اسی بنا پر تناقض بیانی کا الزام قائم کیا ہے، لیکن اس میں تناقض نہیں، اس کا مقصد یہ ہے، کہ حضرت عمرؓ نے حکم ضرور دیا، لیکن اس کی تعمیل اس لئے نہیں ہو سکی تھی کہ کتب خانہ پہلے ہی برباد ہو چکا تھا، مسلمانوں کا مذہب ہے کہ کسی بڑے کام کے محض نیت کرنے سے گناہ نہیں ہوتا، جب تک وہ عمل میں نہ آئے، اس لئے ہم مصنف کے ممنون ہیں، کہ اس نے درحقیقت حضرت عمرؓ کو الزام سے بچا لیا لیکن ہم اس سننے کے مشتاق ہیں کہ ان کے پاس اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ حکم دیا بھی تھا، ان کے الفاظ یہ ہیں۔

"اگرچہ اس واقعہ سے انکار کیا گیا ہے، لیکن اس میں مطلق شک نہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ حکم ضرور دیا، وہ نوشت وخواند سے عاری تھے، ان کے چاروں طرف تعصب اور جہالت کا ماحول چھایا ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر انھوں نے یہ حکم دیا تو یہ کون تعجب کی بات ہے۔"

جو شخص حضرت عمر کو نوشت وخواند سے عاری سمجھتا ہے اس کی تاریخ دانی کے مقابلہ میں ہماری کیا پیش جا سکتی ہے، ان باتوں کے ظاہر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ یورپ میں جو لوگ ہم پر مہربان ہیں، ان کی مہربانی کی بھی یہ حالت ہے،

مصنف مسلمانوں کے عقائد، مسائل، علوم وفنون، صنائع وہنر سے اچھی طرح واقف ہے، اور اس کے متعلق جو تفصیلی بحث اس نے کی ہے، احسانمندی کے قابل ہے، تاہم جا بجا اس کی اصلی فطرت کی جھلک بھی نظر آتی ہے، فقرات ذیل ملاحظہ ہوں،

"تین چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں جو بعد میں، بدر، احد اور احزاب کے نام سے مشہور ہوئیں، آپ کو معلوم ہو گیا، کہ آپ کی سب سے زبردست دلیل تلوار ہے .... اسلام کے خدا کی صورت شاید کفر آلودہ عیسائیت کے خدا کی شکل کی بہ نسبت زیادہ مہیب اور رعب دار ہے، بات یہ ہے کہ خدا کو انسانی صفات سے متصف کرنے کا خیال ان لوگوں کے دلوں سے محو نہیں ہو سکتا۔ جو حکمت آشنا نہیں ہیں، ان کا خدا زیادہ سے زیادہ گویا ایک دیو ہیکل انسان ہے، جس کا سر آسمان سے لگا ہوا ہے، اور ٹانگیں زمین پر ہیں، قرآن کے رو سے زمین ایک سطح مربع ہے، جس کے کناروں پر بڑے بڑے پہاڑ واقع ہیں آسمان کے اوپر بہشت کی بنیاد ہے، جس کی سات منزلیں ہیں، سب سے اونچی منزل خدا کا مسکن ہے، جہاں وہ دیو پیکر انسان کی شکل میں ایک تخت پر بیٹھا ہے اور اس تخت کے دونوں طرف اسی طرح کے ذوالجناح بیل ہیں، جیسے قدیم سریانی بادشاہوں کے محل میں ہوتے تھے۔"

اب ہم اس صفحہ کو الٹ دیتے ہیں، کیونکہ ہم کو اپنے ریویو کو زعفران زار کشمیر بنانا چاہیئے۔

مصنف کی کتاب کا بہترین حصہ وہ ہے، جس میں ان تمام علمی مسائل کو الگ الگ بیان کیا ہے، جو مذہب کے مخالف خیال کئے جاتے تھے، ان پر کس قدر تفصیل بحث کریں گے، لیکن پہلے یہ دیکھنا ہے، کہ ان مسائل کے ساتھ یورپ نے اپنے زمانے میں کیا کیا مصنف نے تفصیل سے لکھا ہے، کہ علمی مسائل کیونکر ابن رشد کے ذریعہ سے یورپ میں پھیلے، ان کے پھیلنے پر ایک محکمہ انکوزیشن کے نام سے قائم کیا گیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ عقائد باطلہ کی سراغ رسانی اور تفتیش کی جائے، ۱۴۸۱ء میں پوپ کے حکم سے باقاعدہ اس کا محکمہ قائم ہوا، اور اس نے پہلے ہی سال یہ قابل فخر کارگذاری دکھائی، کہ دو ہزار شخص اسپین میں زندہ جلا دیئے، اٹھارہ سال کی مدت میں دس ہزار دو سو بیس شخص زندہ جلائے گئے اور ستانوے ہزار اکیس شخص کو اور مختلف طریقوں سے سزائیں دی گئیں، جو لوگ فلسفہ کی حمایت کی وجہ سے ملعون اور بیدین قرار دیئے گئے تھے، ان میں سب سے مقدم ابن رشد تھا۔ اور اس لئے ۱۵۱۲ء میں لیٹرن کونسل نے فیصلہ صادر فرمایا، کہ ان عقائد کا پیرو ملحد قرار دیا جائے گا، محکمۂ انکوزیشن کی داستان حقیقت میں عجیب وغریب ہے اور اس سے عجیب تر یہ ہے کہ جن مسائل پر لوگ زندہ جلائے جاتے یا اور طریقوں سے مار ڈالے جاتے تھے، وہ سب علم ہیئت وغیرہ کے مسائل تھے جن کو مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اس واقعہ پر ہم کو مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالنی چاہیئے۔

(۱) یورپ جو مسلمانوں کو تعصب اور مذہبی جنون کا الزام دیتا ہے اس کے منہ سے یہ الزام کس قدر خوش نما معلوم ہوتا ہے۔

(۲) وہ یورپ جو کسی زمانے میں اس قدر فلسفہ کا دشمن رہ چکا ہے، اور فلسفہ کے جرم میں لاکھوں آدمیوں کو قتل کر چکا ہے، جب آج اس قدر فلسفہ کا حامی اور علم دوست ہے، تو ہم کو اپنے مذہبی علماء سے اس بات کی کوئی ناامیدی نہیں ہے کہ ان کو اجتناب کی وجہ سے جو اجتناب ہے، جاتا رہے گا، اور وہ یورپ کے فلسفہ اور علوم جدیدہ کو اس طرح اپنے نصاب تعلیم میں داخل کر لیں گے، جس طرح انھوں نے یونان کے علوم وفنون کو داخل کر لیا۔

یورپ نے جن علمی مسائل کو مذہب کے مخالف سمجھا تھا، جس پر سزائیں دی جاتی تھیں، اور لوگ قتل کئے جاتے تھے، ان میں سے بعض یہ ہیں۔

(۱) زمین گول ہے، عیسائی کہتے تھے کہ مذہب کی رو سے زمین گول نہیں ہو سکتی،

(۲) زمین کے سوا، اور ستاروں میں بھی آبادی ہو سکتی ہے، برونو اسی جرم میں قتل کیا گیا، کہ وہ تعدد عالم کا قائل تھا۔

(۳) زمین متحرک ہے، اور آفتاب کے گرد گھومتی ہے، کوپرنیکس اسی مسئلہ کی بناء پر ملحد قرار دیا گیا، اور گلیلیو نے چونکہ اس کی تائید کی تھی، اسلئے قید کیا گیا، اور قید خانہ ہی میں مر گیا،

(۴) روح جسم سے الگ ہونے کے بعد عقل کل میں جا کر مل جاتی ہے، اس عقیدہ کی بناء پر ہزاروں آدمی جلا وطن کئے گئے،

اس قسم کے اور بہت سے مسائل ہیں، مصنف نے ان کے بیان میں اس تفصیل سے کام لیا ہے کہ گویا ان مسائل پر مستقل رسالے لکھ دیئے ہیں، جس سے ان کی حقیقت اور ان کی تحقیقات کی تدریجی تاریخ معلوم ہوتی ہے،

ہم نہایت فخر اور نہایت خوشی سے یہ دعوی کرتے ہیں کہ اسلام نے کبھی حکماء اور فلاسفہ کو نقصان نہیں پہنچایا، فارابی، کندی، بو علی سینا، نوبخت، بہمنیار، ابن مسکویہ، بیرونی، ابوبکر رازی، خیام، شیث حکیم اور فلسفی تھے، لیکن ان میں کسی شخص کو انکویزیشن کی عدالت میں نہیں جانا پڑا، نہ وہ زندہ جلائے گئے نہ شکنجے میں کسے گئے، نہ ان کو کسی طرح کی تکلیف دی گئی، خلفاء اور سلاطین اسلام نے ان کا نہایت عزت و احترام کیا، وہ جہاں جاتے تھے، لوگ ان کے لئے آنکھیں بچھاتے تھے، جہاں ان کا ذکر آتا ہے، ان کا نام نہایت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے، مورخین اور فقہا ان کا ذکر مدحیہ الفاظ میں کرتے ہیں، اس سے زیادہ فلسفہ کی کیا عزت کی جا سکتی ہے۔

لا یعرف الفضل الا ذووہ — کمال کی قدر صاحب کمال ہی کر سکتا ہے۔

(الندوہ جلد، نمبر ۸، شعبان المعظم ۱۳۲۸ھ)

ہوا کا رخ دوسری طرف

مشرقی کانفرنس

ندوۃ العلماء کے متعلق ایک فرقہ تو وہ ہے، جس کی متفقہ رائے یہ ہے کہ یہ ایک بے معنی بلکہ مضر کام ہے، لیکن جو لوگ اس کو اصولاً مفید بھی سمجھتے تھے، وہ بھی ہمیشہ مجھ سے کہتے تھے، کہ ہوا کا رخ دوسری طرف ہے اس لئے ندوہ کامیاب نہیں ہو سکتا،

میرا اصول عمل یہ ہے کہ اگر ایک کام قوم اور مذہب کے لئے ضروری ہے، تو ہمارا فرض اس کیلئے کوشش کرنا ہے، کامیابی یا ناکامیابی سے ہم کو بحث نہیں، ہم ان لوگوں میں ہیں جن کا قومی نعرہ یہ تھا۔

اذا ھم القی بین عینیہ عزمہ — ونکب عن ذکر العواقب جانبا
جب قصد کرتا ہے تو اپنے عزم کو آنکھوں کے سامنے رکھ لیتا ہے۔ — اور اس سے کچھ بحث نہیں کرتا کہ انجام کیا ہوگا۔

سمندر میں جب کوئی کشتی شکستہ ڈوبنے لگتا ہے تو اس کو نظر آتا ہے کہ کوسوں تک کنارہ کا پتہ نہیں، کوئی سہارا نہیں، اس کی شناوری سمندر کے عرض و طول کا مقابلہ نہیں کر سکتی، تاہم کیا وہ دیدہ و دانستہ ہاتھ پاؤں مارنا چھوڑ دیتا ہے اور قصداً ڈوب جاتا ہے؟

بھلا اسی قدر فرض ہے، فرض کا ادا کرنا ہی کامیابی ہے، کسی اور کامیابی کی ہم کو ضرورت نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہمیشہ ہاتف غیب کی دھیمی اور آہستہ آواز بھی میرے کانوں میں آیا کرتی تھی کہ ممکن ہے کہ خود ہوا کا رخ بدل جائے۔ شرقی کانفرنس، اسی خواب کی تعبیر ہے۔

مشرقی تعلیم کی تحریکیں اس سے پہلے بھی ہوئیں، ڈاکٹر لائٹنر کی سرگرم کوششوں سے پنجاب میں تعلیم مشرقی کی ایک شاخ یونیورسٹی میں قائم ہوئی، الہ آباد یونیورسٹی میں ملا اور فاضل کے امتحانات اسی خیال کے ناتمام خاکے ہیں، سر سید مرحوم نے ہمیشہ ان کوششوں کی سخت مخالفت کی، پنجاب یونیورسٹی پر ان کے تین پر زور آرٹکل، قلعہ شکن توپیں تھیں، جن کے صدمہ نے مشرقی تعلیم کو چکنا چور کر دیا، الہ آباد یونیورسٹی جب بن رہی تھی، اور بظاہر نظر آتا تھا کہ اس میں بھی مشرقی تعلیم کی شاخ کھولی جائے گی، تو سر سید نے متعدد آرٹکل اس زور کے لکھے کہ اس تجویز کے پرخچے اڑ گئے، سر سید کی مخالفت اس پر مبنی تھی، کہ وہ سمجھتے تھے کہ مشرقی تعلیم کی یہ کوشش، مغربی تعلیم کی ترقی کو روک دے گی، جو ملک کے لئے نہایت ضرر رساں کام ہے۔

اس میں ایک ذرہ شبہہ نہیں، کہ اگر ہم کو یہ یقین ہو کہ مشرقی تعلیم کی کسی تجویز سے، مغربی تعلیم میں ذرہ بھر بھی کمی ہو گی، تو ہمارا فرض ہے کہ اس تجویز سے علانیہ نفرت کا اظہار کر دیں،

مسلمان اس وقت "کش مکش زندگی" کے میدان میں ہیں، ان کی ہمسایہ قومیں مغربی تعلیم ہی کی بدولت ان سے اس میدان میں بڑھ رہی ہیں، اگر خدانخواستہ مسلمان مغربی تعلیم کی کوشش میں ذرا بھی پیچھے رہ جائیں تو ان کی ملکی اور قومی زندگی دفعۃً برباد ہو جائے گی،

لیکن اب وہ حالت نہیں ہے۔ مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے، کہ ان کی دنیوی ترقی صرف اس بات پر موقوف ہے کہ ان کا ایک ایک بچہ انگریزی میں تعلیم یافتہ ہو جائے، لیکن باوجود اس کے یہ ممکن ہے کہ مشرقی تعلیم کے لئے بھی جگہ نکل سکے۔ ترقی یافتہ قوموں کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے، یورپ سب کچھ کر رہا ہے، تاہم ان میں ایک وسیع گروہ موجود ہے، جو اپنی مذہبی تعلیم اور مذہبی لٹریچر کا محافظ ہے، خود ہماری ہمسایہ قوموں کا کیا حال ہے۔ آریہ انگریزی تعلیم میں اس تیزی سے ترقی کر رہے ہیں، کہ مسلمان ان کی گرد تک بھی نہیں پہنچتے، تاہم وہ گروکل بھی قائم کر رہے ہیں جو سنسکرت کی تعلیم کے لئے مخصوص ہے۔ اور جس کا مقصد صرف اپنے مذہب اور اپنے لٹریچر کی اشاعت ہے، اس گروکل میں جو لڑکے داخل ہوتے ہیں، ان سے عہد لیا جاتا ہے کہ دنیا کا کوئی کام نہیں کریں گے، ۲۵ برس کی عمر تک ان کو تعلیم دی جاتی ہے ان کو نہایت سادی اور خشک غذا دی جاتی ہے، سونے کو لکڑی کا تختہ ملتا ہے، اپنے ہاتھ سے سب کام کرنا پڑتا ہے، اس جفاکشی اور دنیاوی بے تعلقی کے ساتھ تین سو دولت مندوں نے اپنے بچے اس میں بھیج دیئے ہیں اور [illegible] ماہوار ایک ایک بچہ کا خرچ دیتے ہیں، ہر سال اس مدرسہ کے لئے لاکھوں کا چندہ جمع ہو جاتا ہے اور اس کی شاخیں جا بجا قائم ہوتی جاتی ہیں،

کیا اس مدرسہ نے آریوں میں انگریزی تعلیم کو کم کر دیا ہے؟ کیا انگریزی تعلیم پر کوئی برا اثر ڈالا ہے؟ بلکہ سچ یہ ہے۔ کہ اس کے تعلیم یافتہ مدرسہ سے نکل کر تمام قوم میں، انگریزی تعلیم اور دنیاوی ترقی کی روح پھونک دیں گے، تیر انداز اپنی جگہ پر رہتا ہے، لیکن تیر کوسوں نکل جاتا ہے، ارجن خود نہیں لڑتے، لیکن ہزاروں لڑنے والے پیدا کر دیتے ہیں،

غرض اگر یورپ کو باایں دنیا طلبی، پادریوں کی حاجت ہے، اگر آریوں کو باایں انگریزی خوانی گروکل کی ضرورت ہے، تو مسلمانوں کو بھی عربی تعلیم اور مذہبی تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت اس وقت تک باقی رہے گی، جب تک مسلمانوں کی قوم کا باقی رہنا ضرور ہے۔

انہیں اسباب سے باوجود تمام مخالفتوں کے ندوہ قائم ہوا، اور باوجود تمام مزاحمتوں کے اس نے اپنا وجود قائم رکھا، یہ سوال پہلے ہی دن پیدا ہوا کہ ندوہ کے تعلیم یافتہ کیا کھائیں گے، اس کا جواب آسان تو یہ تھا کہ اب تک عام مولوی کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اور علم الاعداد سے نظر آتا ہے کہ عربی مدرسوں کی تعداد گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی جاتی ہے، جب ہم اس کو روک نہیں سکتے، تو اس میں کیا ہرج ہے، کہ اس گروہ کو زیادہ بکار آمد بنایا جائے،

لیکن اس کا اصلی اور صحیح جواب یہ ہے کہ مسلمان بہت جلد اس بات کا احساس کریں گے، کہ ان کو اپنی قومیت اور مذہب کے بقا کے لئے مشنری دینی مبلغینِ اسلام قائم کرنے کی ضرورت ہے، یورپ اس قدر دنیوی تعلیم میں منہمک ہے، تاہم صرف لندن میں، مشنری پر دو کروڑ روپیہ سالانہ خرچ کر رہا ہے، جب اسلامی مشنری قائم ہوگی، تو اس کے موزوں اور صحیح کارکن صرف ندوہ مہیا کر سکے گا،

لیکن چونکہ ابھی تک اسلامی مشنری کا باقاعدہ طریقہ نہیں قائم ہوا، اس لئے اس سوال کے جواب دینے کے لئے اور پہلوؤں پر بھی نظر پڑتی تھی، انہیں میں ایک یہ بھی تھا، کہ ندوہ کے تعلیم یافتہ، کیا گورنمنٹ کے بھی کچھ کام آ سکتے ہیں،

گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی اب تک یہ تھی کہ وہ مذہبی تعلیم سے بالکل الگ تھی، اور مشرقی تعلیم بھی اس میں محض برائے نام تھی، لیکن ملک کی عام رائے یہ تھی، کہ مذہبی تعلیم کے بغیر اخلاق اور تربیت کا شیرازہ قائم نہیں رہ سکتا، اس کے ساتھ یہ بھی خیال تھا، کہ عربی اور سنسکرت زبانوں کی اعلیٰ تعلیم بھی سلسلۂ تعلیم کا ایک ضروری حصہ ہے، یہ کہنا مشکل ہے کہ گورنمنٹ نے بھی مذہبی تعلیم کی ضرورت کا احساس کیا یا نہیں، لیکن یہ صاف نظر آتا ہے، کہ گورنمنٹ نے اس بات کو ضروری خیال کیا کہ مشرقی تعلیم کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے، حال میں گورنمنٹ نے جو مشرقی کانفرنس شملہ میں قائم کی، اس کے مقاصد میں سے بعض مقاصد یہ تھے،

(۱) مشرقی و مغربی تعلیم میں اتحاد پیدا کرنا،

(۲) علم الآثار (آرکیالوجی) کی تعلیم دینا، اور جدید طریقۂ تحقیقات آثار قدیمہ سے واقف کرنا،

(۳) اعلیٰ طریقہ پر قدیم و قلمی کتب خانوں کی فہرست سازی (کیٹلوگنگ) کی تعلیم دینا،

(۴) اعلیٰ مشرقی تعلیم کے لئے بیش قرار وظائف مقرر کرنا،

(۵) دیسی زبانوں کو ترقی دینا، اور ان کے امتحانات قائم کرنا،

(۶) علمی مشرقی تعلیم یافتوں کے لئے کالجوں میں پروفیسری، مدرسوں میں ٹیچری، عجائب خانوں میں تحقیقات آثار قدیمہ، اور قدیم کتب خانوں میں ترتیب فہرست کے لئے عہدے قائم کرنا،

(۷) کلکتہ کی مشرقی درسگاہوں کو متفق و متحد کرنا،

(۸) افسروں کی زباندانی کا امتحان لینا،

(۹) کلکتہ میں اغراض بالا کے لئے ایک عظیم الشان مشرقی درسگاہ قائم کرنا،

یہ ظاہر بات ہے کہ علماء کا گروہ مسلمانوں کی جماعت کا ایک ضروری جزو ہے، ان کی تعداد کثیر ملک میں موجود ہے، اور ہمیشہ موجود رہے گی، ان کا قوم پر نہایت قوی اثر ہے، عربی زبان ایک علمی زبان ہے، ان اسباب سے یہ مناسب نہیں کہ مشرقی تعلیم سے بالکل بے اعتنائی اختیار کی جائے، البتہ اس کی ضرورت ہے کہ اس کو زیادہ بکار آمد بنایا جائے، اور مذہبی حصہ کو چھوڑ کر باقی چیزوں میں ایسی ترقی اور اصلاح کی جائے، کہ مشرقی تعلیم یافتہ لوگوں کی معاش کے لئے کچھ وسائل پیدا ہو سکیں،

کانفرنس نے جو کچھ طے کیا ہے، ابھی اس کی باضابطہ منظوری نہیں ہوئی ہے اس لئے اس کی تفصیل ابھی غیر ضروری ہے، لیکن بظاہر حسب ذیل نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔

(۱) گورنمنٹ کی طرف سے ایک انسپکٹر ہوگا، جو قدیم عربی مدارس کا معائنہ کر سکے گا، اگر مدرسہ کے مہتمم ایسی نگرانی کو پسند کریں گے،

(۲) جن مدرسوں کو گورنمنٹ اس قابل سمجھے گی، ان کو کچھ ماہوار امداد دے گی،

(۳) کلکتہ میں بہت بڑے وسیع پیمانہ پر ایک مشرقی درس گاہ قائم ہوگی، مدارس عربیہ کے فارغ شدہ اگر چاہیں گے تو اس درس گاہ میں تعلیم حاصل کریں گے،

(۴) اس درس گاہ کے تعلیم پانے والوں کو بیش قرار وظیفے دیئے جائیں گے،

(۵) اس درس گاہ سے سند لینے کے بعد ان کو متعدد اسامیاں مل سکیں گی، جو مشرقی تحقیقات سے متعلق ہوں گی،

(۶) مدارس عربیہ جن کو گورنمنٹ تسلیم کرے گی، اور جن کے تعلیم یافتہ کم سے کم انگریزی زبان جانتے ہوں گے، ان کو کالجوں اور اسکولوں کی پروفیسری اور مدرسی مل سکے گی،

ان واقعات کے بیان کرنے سے غرض یہ ہے کہ جو فرقہ اب تک بغیر کسی معاوضہ کے عربی علوم کی تحصیل میں مشغول تھا، اب کسی قدر ذریعۂ معاش حاصل ہونے کی صورت میں امید ہے کہ اپنا کام زیادہ مستعدی اور زیادہ وسعت حوصلہ سے انجام دے، ہم لوگ اگر عربی علوم اور مذہبی علوم کے جان دادہ اور جان نثار ہیں، تو اس قدر معاوضہ ہمارے لئے بالکل کافی ہے، اور کوئی غیر گورنمنٹ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے،

(الندوہ، جلد ۸ نمبر ۸)
اگست ۱۹۱۱ء

ریاست حیدر آباد کی مشرقی یونیورسٹی

معلوم نہیں مسلمانوں میں کون سی مبارک ساعت میں تقلید کی بنیاد پڑی تھی، کہ زمانے کے سیکڑوں ہزاروں انقلابات کے ساتھ بھی اس کی بندشیں اب تک کمزور نہیں ہوئیں، تعجب اور سخت تعجب یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ فرقہ جو اجتہاد اور جدت کا دعویدار ہے، اور در حقیقت جدید تعلیم کا یہی اثر ہونا چاہیئے تھا، وہ بھی اس طرح بے سمجھے بوجھے، ایک عام راستے پر پڑ لیا ہے، اور کچھ نظر نہیں آتا، کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، جس تعلیم اور نتائج تعلیم کا اس قدر شور و غل ہے، وہ کیا ہے؟ کالجوں کی ڈگریاں اور نوکریاں وہ گر ہیچ، شاید کہا جائے کہ اس کے سوا ہم اور کیا کر سکتے ہیں، اور اسی لئے تو ہم اپنی خاص یونیورسٹی چاہتے ہیں، کہ اپنی ضرورتوں کے موافق اپنی تعلیم کا سامان بہم پہنچائیں، لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس قدر روپیہ بہم نہیں پہنچتا، کہ یونیورسٹی بن سکے، لیکن سوال یہ ہے، کہ جہاں یونیورسٹی بن سکتی ہے۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ حیدر آباد میں عنان تعلیم انہیں لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے، جو ہندوستان میں یونیورسٹی بنانے کے محرک اور

جان دادہ ہیں، یونیورسٹی کے لئے دس لاکھ روپیہ مانگا جا رہا ہے، حیدرآباد میں ایک منٹ میں یہ رقم مل سکتی ہے، حیدرآباد میں صرف ایک کالج پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف ہو رہا ہے۔ حیدرآباد کو اس بات کی کچھ پروا نہیں ہو سکتی کہ اگر وہ اپنی یونیورسٹی بنائے، تو اس کے تعلیم یافتہ انگریزی گورنمنٹ میں نوکریاں نہ پائیں گے، کیوں کہ حیدرآباد خود ایسی وسیع ریاست ہے، کہ وہاں کے تعلیم یافتہ دوسری جگہ نوکری کرنے کے محتاج نہیں، لیکن تقلید پرستی کی یہ حالت ہے، کہ انگریزی تعلیم میں کسی قسم کی اصلاح و ترمیم ایک طرف، خاص مشرقی تعلیم میں بھی جس کے لئے وہاں ایک دارالعلوم ہے، پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کے بیہودہ نصاب کی آج تک تقلید کی گئی، پنجاب نے مولوی فاضل اور مولوی عالم وغیرہ کے جو امتحانات مقرر کئے ہیں، وہ دنیا کے کام کے ہیں نہ دین کے، تاہم آج تک اسی کی محکومی کی گئی، اور اس وقت تک آزادی کا خیال نہ آیا جب تک خود یونیورسٹی نے یہ قاعدہ نہیں بنایا کہ ہم دوسرے ملک کے لوگوں کو اپنے امتحانات میں شریک نہیں کر سکتے،

دو سہ بار با تو گفتم کہ مرا بہیچ بستان نشد اتفاق، شاید کہ برایں بہا گرانم

بہرحال خوبی تقدیر سے پنجاب یونیورسٹی نے حیدرآباد کے طلبہ کو اپنے امتحانات میں شامل کرنے سے روکا، اب اگر یہ ممکن ہوتا کہ یہ سب طلبہ وہاں کے انگریزی اسکولوں میں داخل ہو جاتے، تو پھر اسی تقلید پرستی کے دام میں گرفتار ہو جاتے، اکثر

از دام جستہ باز سوے دام میرود

لیکن سات سو طلبہ جو انگریزی کے ایک حرف سے واقف نہ تھے اور جن میں سے اکثر انگریزی پڑھنا بھی نہیں چاہتے تھے، وہ کیوں کر ایک نئی زندگی اختیار کر سکتے تھے، غرض اب یہ خیال ہوا، کہ دارالعلوم کا نصاب یہاں کی ضرورتوں کے لحاظ سے خود تیار کیا جائے، نواب عماد الملک بہادر بلگرامی سی، ایس، آئی، ممبر انڈیا کونسل اس وقت ناظم تعلیمات تھے، انہوں نے سرکار میں یہ تجویز پیش کی، اور منظور ہوئی، اس کے بعد نواب صاحب موصوف نے میرے نام ایک سرکاری مراسلہ بھیجا، جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"اس وقت باعث تصدیع یہ امر ہوا کہ میں نے اس حادثہ (میرے پاؤں کے زخمی ہونے کی طرف اشارہ ہے) کے چند ہی روز پہلے سرکار میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ ہمارے دارالعلوم کا تعلق اب پنجاب یونیورسٹی سے منقطع ہو گیا ہے، پس مناسب ہوگا، کہ ہم اپنے لئے خود ہی مناسب انتظام کریں، یعنی عربی و فارسی نصاب تعلیم مرتب کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی جلد مقرر کی جائے جس میں ایک رکن آپ ہوں، اور نصاب تعلیم زمانہ حال کی ضرورتوں کے لحاظ سے مرتب ہو تاکہ جو لوگ اس مدرسہ میں تعلیم پاکر امتحان میں کامیابی حاصل کریں، وہ سرکاری خدمات ادا کرنے کے اہل پائے جائیں،

اس امر کے اطلاع دینے سے میرا یہ منشا نہیں کہ آپ سے فوراً تکلیف گوارا کرنے کی خواہش کروں، بلکہ محض اس قدر اطمینان حاصل کرنا منظور ہے، کہ کامل صحت کے بعد آیا یہ امر ممکن ہوگا کہ آپ یہاں تشریف لائیں، ایسے قومی کاموں میں آپ ہمیشہ تکلیف گوارا کرتے رہے ہیں، اگر آپ کا تشریف لانا ممکن نہ ہو، تو کیا آپ نصاب تعلیم پنجاب یونیورسٹی پر نظر غائر ڈال کر ایک جدید نصاب وہیں مرتب فرما سکتے ہیں اور ترمیم نصاب میں چند ابواب مدنظر رہیں، تو بہتر ہے۔

(۱) اصلاح نصاب موجودہ پنجاب یونیورسٹی بہ لحاظ مقتضائے وقت و زمانہ و ضروریات خدمات حکومتی،

(۲) تکمیل تحصیل علوم شرقیہ،

مد دوم کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ پنجاب کی اورینٹل تعلیم ناقص ہے بہت سے علوم جن سے تکمیل فضیلت کی ہوتی ہے، اس تعلیم میں متروک ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ جماعت مولوی فاضل سے بالاتر اکمل مرتبہ وہ جماعتیں ہوں جن میں تحصیل کی تکمیل ہو سکے، میری رائے ناقص میں اگرچہ سلسلۂ نظامیہ کی پابندی ضرور نہیں ہے، مگر تکمیل تحصیل کے لئے بہت کچھ اضافہ کتب درسیہ کی ضرورت ہے"

نواب صاحب موصوف کا یہ خط اس وقت پہنچا، جب مجھ پر پاؤں کے زخمی ہونے کا واقعہ گذر چکا تھا، اور میں صاحب فراش تھا، جب اس سے صحت ہوئی تو مولوی عزیز مرزا صاحب ہوم سکرٹری حیدرآباد نے نواب عماد الملک بہادر کی تحریک کی بنا پر مجھ کو پھر طلب کیا، اور میں جون ۱۹۱۸ء میں حیدرآباد گیا، وہاں چند روز رہ کر ایک نصاب تیار کیا، اور اس کے متعلق ایک یادداشت لکھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نصاب کن اصول پہ تیار کیا گیا ہے، یادداشتِ مذکور کی نقل درج ذیل ہے،

رپورٹ

متعلق

اصلاح نصاب دارالعلوم حیدرآباد

بموجب مراسلہ ناظم صاحب سابق نواب عماد الملک بہادر و مراسلہ ناظم صاحب حال مورخہ ۲۳ ماہ الٰہی [illegible] ہجری نشان (۲۲۲۳) دارالعلوم کے نصاب اور مدت تعلیم میں جو تغیر اور اصلاح میں نے کی ہے، اور جس کا نقشہ اس یادداشت کے ساتھ منسلک ہے، اس کی نسبت میں ایک علیحدہ مفصل یادداشت پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ ترمیم اور اصلاح کن اصولوں پر کی گئی ہے، اور ترمیم اور اصلاح کے مہمات امور کیا ہیں،

نصاب دارالعلوم کی ترتیب دینے کے وقت سب سے پہلے یہ امر پیش نظر ہونا چاہیئے، کہ دارالعلوم کا اصلی مقصد کیا ہے، اور کس قسم کے لوگ، اس سے پیدا کرنے مقصود ہیں،

دارالعلوم جب تک پنجاب یونیورسٹی سے متعلق رہا، اس کی غرض صرف ایسے لوگوں کا پیدا کرنا تھا، جو سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے لائق ہوں اور اس مقصد میں دارالعلوم نمایاں طور پر کامیاب رہا، لیکن اب جب کہ دارالعلوم خود مختار اور آزاد ہو گیا ہے، اس کے مقاصد زیادہ وسیع ہو گئے ہیں، اس کی غرض اب ایسے اشخاص کو پیدا کرنا ہے جو نہ صرف سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے قابل ہوں، بلکہ اس سے ایسے اشخاص بھی پیدا ہوں جو شرعی خدمات انجام دینے کے قابل ہوں، جو علوم دینیہ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، ادب میں کمال رکھتے ہوں، جو ملک میں مذہبی عالم کی حیثیت سے تسلیم کیے جا سکتے ہوں، اور اس بنا پر ان کی ہدایت اور تلقین کا عامۂ اہل اسلام پر اثر پڑ سکے، اور وہ عوام میں عمدہ اخلاق اور مذہبی خیالات پھیلا سکیں، جو علوم قدیمہ کے ساتھ جدید علوم و فنون اور جدید خیالات سے بھی آشنا ہوں، تاکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ پر ان کا اثر پڑ سکے،

یہ امر بھی خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کہ اس وقت تک جو تعلیم جدید تمام ہندوستان میں جاری ہے، اس کی نسبت تمام اہل الرائے نے تسلیم کر لیا ہے،

کہ وہ ہماری ضرورتوں کے لئے کافی نہیں، لیکن چونکہ بغیر اس طریقۂ تعلیم کے سرکاری نوکریاں حاصل نہیں ہو سکتیں، اس لئے چارو ناچار، اسی طریقہ کو اختیار کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس طریقۂ تعلیم میں ہماری مذہبی اور قومی خصوصیات کا کوئی انتظام نہیں، اس میں نہ مذہبی تعلیم ہے، نہ قومی تاریخ سے کچھ واقفیت ہو سکتی ہے، نہ اسلامی اخلاق، اور مسائل اخلاق کا علم ہو سکتا ہے، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک شخص گو بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کر لے، لیکن اسلامی مسائل، اسلامی تاریخ، اسلامی اخلاق کے متعلق، اسکی واقفیت، اور اس کا پوزیشن اس سے کچھ زیادہ نہیں ہو سکتا، جو ایک عامی مسلمان کا ہو سکتا ہے۔

با ایں ہمہ ہندوستان میں اس مشکل کا کچھ علاج نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم، اس قدر وقت اور فرصت نہیں دے سکتا، کہ دوسری چیزوں کے حاصل کرنے کے لئے موقع ہاتھ آئے،

لیکن چونکہ ریاست نظام ایک وسیع مملکت ہے۔ اور اس وقت تک اس نے سرکاری نوکریوں کے لئے یونیورسٹی کی ڈگریوں کی قید لازمی نہیں قرار دی ہے، اس لئے اس کو موقع ہے، کہ موجودہ طریقۂ تعلیم کے علاوہ، ایک ایسا خاص سلسلۂ تعلیم بھی قائم کرے جس میں انگریزی تعلیم کے ساتھ اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ بھی شامل ہو اور جس کے تعلیم یافتہ گویا دونوں قسم کی تعلیم کا مجموعہ ہوں، اس قسم کی تعلیم کا انتظام دار العلوم میں ہو سکتا ہے۔ اور ہم کو موجودہ نصاب کے مرتب کرتے میں اس پہلو کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

اغراض مذکورہ بالا کے لحاظ سے نصاب موجودہ میں جو تغیر اور اضافہ کیا گیا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) ہر فن کی تعلیم کا عمدہ طریقہ یہ ہے، کہ ایسی کتابیں درس میں رکھی جائیں جن میں تمام مسائل نہایت سادہ، صاف اور واضح طریقے سے بیان کئے گئے ہوں، تاکہ طالب العلم بہ آسانی تمام مسائل پر حاوی ہو جائے، اس بنا پر وہ کتابیں جو معما اور چیستان کے طور پر اس قدر مختصر اور مغلق لکھی گئی ہیں، کہ ایک ایک سطر میں ایک ایک صفحے کے مطالب کھپا دیئے گئے ہیں، وہ خارج کر دی گئیں،

(۲) قدیم نصاب میں اکثر ایسی کتابیں ہیں، جن میں دوسرے علوم کے مسائل مخلوط کر دیئے گئے ہیں، اس لئے خلط مبحث کی وجہ سے طالب العلم، اس فن کے مسائل سے دور پڑ جاتا ہے۔ مثلاً ملا حسن، میر زاہد، قاضی مبارک وغیرہ کہ یہ کتابیں در اصل منطق میں ہیں، لیکن ان میں فلسفہ اور امور عامہ کے دقیق مسائل اس قدر شامل کر دیئے ہیں، کہ اصل فن کے مسائل پر گویا پردہ پڑ گیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے، کہ یہ تمام کتابیں پڑھ کر بھی طالب العلم کو خاص منطقی مسائل کی مشق نہیں ہوتی اور وہ نہیں کر سکتا، کہ تقریر اور مناظرے میں اپنے دعووں کو اشکال منطق کے ذریعے سے ثابت کر سکے۔

اس بنا پر نصابِ حال میں ہر فن میں وہی کتابیں رکھی گئی ہیں، جن میں خالص اسی فن کے مسائل استیعاب کے ساتھ مذکور ہیں،

(۳) قدیم نصاب میں، قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ، نہایت کم ہے، قرآن مجید کا متن تک درس میں نہیں، تفسیروں میں صرف دو تفسیریں درس میں داخل ہیں، ایک جلالین جس کے الفاظ اور قرآن مجید کے الفاظ عدد میں برابر برابر ہیں اور دوسری بیضاوی جس کے صرف ڈھائی پارے پڑھائے جاتے ہیں، جو کتاب کا پندرھواں حصہ بھی نہیں، اس لئے قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ زیادہ وسیع کیا گیا ہے۔

(۴) قدیم نصاب میں ادب اور لٹریچر کا حصہ نہایت کم ہے، حالانکہ ادب کے بغیر تفسیر، حدیث، اصول فقہ کسی چیز میں کمال نہیں حاصل ہو سکتا، اس بنا پر، ادب کا نصاب بہت بڑھا دیا گیا ہے،

(۵) یہ عام شکایت ہے، کہ عربی خواں، سب کچھ پڑھ جاتے ہیں، لیکن چند سطریں صحیح عربی نہیں لکھ سکتے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ادب کی تعلیم کم تھی، دوسری یہ کہ انشا پردازی اور مضمون نگاری کی مشق نہیں کرائی جاتی تھی، اس لئے نصاب حال میں انشا پردازی کے لئے خاص گھنٹے مقرر کئے گئے

(۶) عقائد و علم کلام میں صرف ایک کتاب اور وہ بھی معمولی درجہ کی درس میں تھی، یعنی شرح عقاید نسفی، حالانکہ یہ فن، تمام اسلامی فنون پر مقدم اور سب کا اصل الاصول ہے اس لئے اس فن میں متعدد اور بلند پایہ کتابیں نصاب میں رکھی گئیں،

(۷) تاریخ اسلام اور عام تاریخ کی ایک کتاب بھی نہ تھی، اس لئے اس فن کی کتابیں بھی داخل کی گئیں،

(۸) علوم جدیدہ کی بعض کتابیں جو عربی میں ترجمہ ہو گئی ہیں، نصاب میں شامل کی گئیں، لیکن اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا ضرور ہے کہ ان کے پڑھانے کا انتظام مشکل ہے ہمارے علما، ان کتابوں کو پڑھا نہیں سکتے، اور انگریزی خواں، عربی زبان سے آشنا نہیں، یہ ہو سکتا تھا، کہ اردو میں جو کتابیں موجود ہیں، وہ داخل نصاب کر دی جائیں، لیکن جہاں تک مجھ کو معلوم ہے طبعیات کی جو کتابیں اردو میں موجود ہیں، وہ مڈل کے رتبہ سے زیادہ نہیں، اس کے سوا عربی خواں طلبہ اردو زبان کی کتاب کو وقعت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے، اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ ایسے پروفیسر مقرر کئے جائیں جنہوں نے بی/اے، میں سائنس لیا ہو اور عربی زبان ان کی سکنڈ لینگوئج رہی ہو

(۹) انگریزی زبان بطور سکنڈ لینگوئج کے لازمی قرار دی گئی ہے، میں انگریزی زبان سے واقف نہیں ہوں، اس لئے میں نے انگریزی کتابوں کا نام نہیں لکھا ہے، لیکن اس قدر بخوبی جانتا ہوں، کہ موجودہ نصاب میں اس قدر گنجائش ہے، کہ انگریزی زبان دانی کی کتابیں، انٹرنس تک کی اس میں شامل کی جا سکتی ہیں، اور درجۂ فاضل کے بعد دو برس اس غرض سے رکھے گئے ہیں، کہ جو شخص چاہے دو برس تک صرف انگریزی زباندانی کی تعلیم حاصل کرے جس سے وہ انگریزی زبان پر بخوبی قادر ہو سکتا ہے۔

(۱۰) نصاب سابق میں ابتدا سے اخیر تک مدتِ تعلیم انیس برس تھی، لیکن یہ مدت بہت زیادہ تھی، اس لئے گھٹا کر کل مدت چودہ برس قرار دی گئی ہے،

(۱۱) نصاب مرتبہ کی ترتیب یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کی مدت پانچ سال قرار دی گئی ہے اور یہ فرض کیا گیا ہے، کہ لڑکا ساتویں برس کے سن سے دار العلوم کی ابتدائی جماعتوں میں لیا جائے گا، یہ تعلیم پانچ برس میں تمام ہوگی، اور اس میں، اردو اور ابتدائی فارسی اور حساب اور کسی قدر انگریزی کی تعلیم ہوگی،

اس درجہ کے بعد، دو الگ شاخیں شروع ہوں گی، یعنی منشی اور عالم اور طالب العلم کو اختیار ہوگا، کہ ان دونوں شاخوں میں سے جس شاخ کو چاہے اختیار کرے،

منشی کے تین سال، اور منشی عالم کے دو سال اور منشی فاضل کا ایک سال مقرر کیا گیا ہے، منشی فاضل تک طالب العلم کو فارسی زبان میں عمدہ مہارت اور عربی کی سواد خوانی اور انگریزی بقدر عام ضرورت آجائے گی،

عربی کے دو درجے قرار دیئے گئے،

عالم :- اس کی مدت تعلیم آٹھ برس ہے، یہ درجہ بی اے کے برابر ہے، اس میں تمام علوم متداولہ عربی اور بعض علوم جدیدہ اور انگریزی زبان انٹرنس کے درجہ تک آجانے گی، یہ میری خاص رائے ہے۔ لیکن اگر یہاں کے حالات کے لحاظ سے ضروری ہو تو بیچ میں ایک اور درجہ مولوی یا ملا کے نام سے قائم کیا جائے، اور یہ درجہ پانچویں سال تک تمام ہو جائے، اس کے بعد تین برس عالم کے لئے رکھے جائیں۔

فاضل :- اس کی مدت تعلیم دو برس ہے، اور یہ درجہ ایم اے کے برابر ہے اسمیں کسی ایک خاص فن کی پوری تعلیم ہوگی، اور طالب العلم اس خاص فن کی تکمیل کرے گا اور اسی فن کے انتساب سے موسوم ہوگا، مثلاً مفسر، ادیب، فقیہ وغیرہ،

عالم یا فاضل کے درجے کے بعد ضرور ہے کہ چند طلبہ کو دو برس تک خالص انگریزی زبان سکھائی جائے تاکہ انگریزی زبان میں تحریر اور تقریر کا ملکہ ہو، اور ایسے علماء پیدا ہوں کہ یورپ کی علمی تحقیقات کو اسلامی علوم میں اضافہ کر سکیں، اور انگریزی داں جماعت کے مجمع میں انہیں کی زبان اور خیالات میں اسلامی عقائد اور مسائل پر تقریر کر سکیں،

۱۲ :- نصاب تعلیم کے نقشے کے ملاحظے سے چونکہ ہر فن کی کتابیں یکجائی طور پر پیش نظر نہ ہوں گی، اس لئے اس موقع پر ہر فن کی الگ الگ کتابیں یکجا لکھ دی جاتی ہیں، جس سے بیک نظر اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملے گا کہ ہر فن میں کس پایہ کی، اور کس قدر کتابیں نصاب میں تجویز کی گئی ہیں،

ادب و معانی و بیان :- اخوان الصفاء، اطباق الذہب، عبدالمومن اصفہانی، سبعہ معلقہ، مجموعۃ الادب، حسن التوسل الی صناعۃ الترسل، مختصر المعانی، متنبی، یتیمۃ بن المقفع، مقامات حریری، حماسہ، نقد الشعر ابن قدامیہ، نہج البلاغۃ، اسرار البلاغۃ، عبدالقاہر الجرجانی، کتاب الصناعتین ابو ہلال عسکری،

فقہ و اصول فقہ :- قدوری، سراجی، در مختار، ارکان، اربعہ مولانا بحر العلوم، ہدایہ، نور الانوار، تحریر ابن الہمام، مسلم الثبوت، توضیح و تلویح، رسالۂ امام شافعی،

قرآن مجید و تفسیر :- الہدایۃ الی الصراط المستقیم، فوز الکبیر فی اصول التفسیر، جلالین، بیضاوی، احکام القرآن ابو بکر رازی،

فلسفہ :- ہدیہ سعیدیہ، شرح ہدایۃ الحکمت از خیر آبادی، شرح اشارات رازی و طوسی، شرح حکمۃ الاشراق، شمس بازغہ، دروس الاولیہ فی العلوم الجدیدہ، ہیأت جدیدہ

کلام و اسرار الدین :- رسالہ التوحید، معالم امام رازی، حجۃ اللہ البالغہ، اس یادداشت اور نصاب پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی قرار پائی، جس کا اجلاس شعبان ۱۳۳۶ھ میں قرار پایا، لیکن چونکہ عین اسی زمانہ میں ندوہ کی خاص ضرورت نے مجھ کو لکھنؤ واپس آنا پڑا، اس لئے وہ اجلاس ملتوی ہو گیا، اس کے بعد میں ۲۳ جنوری ۱۹۱۹ء کو پھر حیدر آباد آگیا، اور ایک کمیٹی میں نصاب مرتبہ پیش کیا گیا، اس کمیٹی میں مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد عدالت و مشیر تعلیمات شمس العلماء مولوی سید علی صاحب بلگرامی، مولوی انوار اللہ صاحب استاد حضور نظام، سید ابوبکر شہاب یمنی، مولوی عبدالحلیم صاحب شرر مددگار ناظم تعلیمات اور دیگر اصحاب شریک تھے، لیکن چونکہ اس کمیٹی میں کچھ مراتب باقی رہ گئے تھے اسلئے ۱۷ فروری ۱۹۱۹ء کو اس کا پھر ایک اجلاس ہوا جس کے پریسیڈنٹ جناب نواب فخر الملک بہادر وزیر عدالت تھے، اور جس میں نواب عماد الملک بہادر، اور ڈاکٹر سید سراج الحسن ناظم تعلیمات بھی بحیثیت رکن کے شریک تھے،

دونوں کمیٹیوں میں آزادی سے ہر پہلو پر بحث ہوئی اور کسی قدر تغیر اور ترمیم کے ساتھ نصاب مرتبہ منظور کیا گیا۔

نواب عماد الملک بہادر کی رائے تھی کہ علوم عربیہ کے ساتھ انگریزی کی تعلیم نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کو نصاب سے خارج کر دینا چاہیئے، لیکن یہ جب ظاہر کیا گیا کہ علوم عربیہ میں بہت سی فضول کتابیں جو منطق و فلسفہ کی شامل تھیں خارج کر دی گئی ہیں، اس لئے کافی گنجائش ہو سکتی ہے، تو نواب صاحب موصوف نے بھی اتفاق ظاہر کیا،

ہم کو اس پر کسی قدر تعجب ہوا، کہ اس کمیٹی میں نہایت متقشف اور پرانے خیال کے علماء بھی شریک تھے، تاہم انگریزی کے داخل کرنے سے کسی نے انکار نہیں کیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدر آباد میں، ہندوستان کی بہ نسبت، روشنخیالی کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

نصاب کے طے پانے کے بعد اسی کے موافق، دار العلوم میں جدید اسٹاف قائم ہوگا، اس کے ساتھ ایک مجلس بطور سینیٹ کے قائم ہوگی اور اسی کے نئے فیلوز منتخب ہوں گے اس طرح ایک مشرقی یونیورسٹی کی بنیاد قائم ہو جائے گی،

نہایت مسرت کی بات ہے، کہ اس وقت افسران تعلیم، نواب فخر الملک بہادر وزیر عدالت اور مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد عدالت اور سید سراج الحسن صاحب ناظم تعلیمات ہیں، اس لئے ہر طرح پر امید ہے کہ یونیورسٹی عمدہ اور مستحکم اصول پر قائم ہوگی،

یہ ہم نے بار بار کہا ہے، اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لئے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جزء مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔

در کفے جام شریعت، در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

(الندوہ، ج ۶ نمبر ۲، مارچ ۱۹۱۹ء)

طبقات ابن سعد

ہم نہایت فیاض دلی سے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں، کہ یورپ کو آج کل ہمارے علوم و فنون کے ساتھ جو اعتناء ہے، اور جس طرح وہ ہمارے قدیم خزانوں کے بیش بہا نوادر، ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کر رہا ہے، ہم خود نہیں کرتے، بلکہ نہیں کر سکتے، مسلمانوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آج تک یورپ نے عربی کی کون کون سی نایاب کتابیں نہایت اہتمام کے ساتھ چھاپ کر شائع کی ہیں، انشاء اللہ ہم کسی آئندہ پرچہ میں اس کے متعلق ایک مفصل مضمون لکھیں گے، اس وقت ہم جس کتاب کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں، وہ طبقات ابن سعد ہے، جو ہمارے مضمون کا عنوان ہے، یہ کتاب مشہور محدث ابن سعد کی تصنیف ہے، ابن سعد اگرچہ واقدی کے شاگرد تھے، لیکن تمام محدثین نے تصریح کی ہے کہ وہ اپنے استاد کے خلاف ثقہ اور صادق الروایہ تھے، اس کتاب میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر اپنے زمانہ تک کے لوگوں کے تراجم اور حالات لکھے ہیں، یہ کتاب ۱۲ ضخیم جلدوں میں ہے، لیکن قوم کی بدمذاقی سے اس کا کامل نسخہ کہیں کسی مقام پر پایا نہیں جاتا، ہم نے قسطنطنیہ اور مصر کے کتب خانے دیکھے ہیں، وہاں بھی اس کا پورا نسخہ موجود نہیں، جرمن کے ایک مشہور فاضل نے جس کا نام پروفیسر ساخو ہے، اس کتاب کے چھاپنے کا ارادہ کیا، اور اس کے نسخوں کے بہم پہنچانے کی فکر کی، شہنشاہ جرمن کو جب یہ حال معلوم ہوا، تو انہوں نے پورے ایک لاکھ روپیے، اس کتاب کے مصارف کے لئے شاہی خزانہ سے عطا کئے، پروفیسر موصوف نے کتاب کی تلاش میں مصر اور یورپ کے تمام کتب خانوں کو چھان ڈالا، چنانچہ بڑی جد و جہد سے اس نے متعدد نسخے پیدا کئے، اور

نسخوں کی تقسیم اور مقابلہ شروع کیا، مدت کی محنت کے بعد اس نے ایک جلد چھاپ کر شائع کی جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ باقی جلدیں وقتاً فوقتاً شائع ہوں گی، یہ جلد تین سو صفحوں میں ہے اور ہر صفحہ میں ۲۹ سطریں ہیں، ٹائپ جس نہایت دراودرد لیکن نہایت صاف اور پاکیزہ چھپی ہے، اس جلد میں فقط ان صحابہ کے حالات ہیں جو جنگ بدر میں شریک تھے،

ہمیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ صحابہؓ کے حالات میں متاخرین محدثین نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، مثلاً استیعاب، اصابہ، اسد الغابہ، لیکن ابن سعد کی کتاب میں جو تفصیل اور جامعیت ہے، ان کتابوں کو اس سے کچھ نسبت نہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید متاخرین کو یہ کتاب ہاتھ نہیں آئی یا ان کا مذاق ایسا تھا، کہ اس قدر تفصیل حالات کو وہ ضروری نہ سمجھے،

اس کتاب میں ایک ایک جزئی واقعہ کو بہ سند متصل لکھا ہے، اور چونکہ مصنف کا زمانہ عہد نبوت کے قریب ہے، اس لئے سلسلۂ روایت میں تین چار راوی سے زیادہ نہیں ہوتے، یہ کتاب ہم کو ایک انگریز دوست نے تحفۃً بھیجی ہے، اس لئے ہمکو اس کی قیمت معلوم نہیں، البتہ اس قدر معلوم ہے کہ جرمن میں بمقام برٹیل چھپی ہے اور یورپ کے تاجروں سے مل سکتی ہے۔

(الندوہ ج ۱ نمبر ۱)

مناقب عمر بن عبد العزیزؒ (از ابن جوزی)

علامہ ابن جوزی نے جو مشہور محدث گذرے ہیں، حضرت عمر فاروق اور عمر بن عبد العزیزؒ کے حالات میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام سیرۃ العمرین رکھا تھا، ہم نے یہ کتاب مصر میں کتب خانہ خدیویہ میں دیکھی تھی، جس سے الفاروق کے لئے بہت سے مفید معلومات انتخاب کئے تھے، لیکن چونکہ اس وقت عمر بن عبد العزیزؒ کے متعلق کوئی خاص ضرورت پیش نہ تھی، ہم نے دوسرے حصہ کو نظر انداز کر دیا تھا، جہاں تک ہم کو معلوم ہے، ہندوستان میں اس کتاب کا کوئی نسخہ موجود نہیں، اس لحاظ سے بار بار افسوس آتا تھا کہ اب اس گنجینہ سے تمتع اٹھانے کی کوئی امید نہیں رہی، لیکن ہم یورپ کے فضلاء کے ممنون ہیں کہ ان کی بدولت اس نادر اور دلچسپ کتاب کو گو اصلی صورت میں نہیں، لیکن اس کے قریب قریب ایک دوسرے قالب میں دیکھ سکے،

سلطان صلاح الدین کے زمانہ میں اسامہ بن منقذ ایک عرب سپہ سالار تھا، جو فوجی قابلیت کے ساتھ علمی مذاق بھی رکھتا تھا، اس نے متعدد دلچسپ کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے کتاب العصا اور ایک اور کتاب جس میں مصنف نے اپنے زمانہ کے دلچسپ اور نادر چشم دید واقعات قلم بند کئے ہیں، یورپ میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اسی مصنف نے علامہ ابن جوزی کی کتاب مذکورۂ بالا میں سے دوسرا حصہ جو عمر بن عبد العزیز کے متعلق تھا، جدا کر کے ایک علیحدہ کتاب کی شکل میں مرتب کیا، اس مصنف نے اصل کتاب میں جو کچھ تصرف کیا وہ صرف روایتوں کے اسناد کا حذف کرنا اور مکرر طرق روایت میں سے ایک کا انتخاب کر لینا تھا،

اس کتاب کو یورپ کے ایک فاضل نے جس کا نام ہنری بیکر ہے ۱۸۹۹ء میں چھاپ کر شائع کیا، چونکہ یہ کتاب نہایت نایاب اور نہایت دلچسپ معلومات پر مشتمل ہے، اس لئے ہم اس پر ایک مختصر سا ریویو کرنا مناسب سمجھتے ہیں،

سوانح عمری اور بایوگرافی کا فن آج کل ترقی کی جس حد تک پہنچا ہے اس کی نظیر اگلے زمانہ میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے، لیکن یہ امر تعجب سے دیکھا جا سکتا ہے کہ جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی اس وقت مسلمانوں نے اس فن کو اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ اس کتاب میں جو ابواب قائم کئے گئے ہیں اور ان کی تعداد ہم تک پہنچی ہے، ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عمر بن عبد العزیز کی ولادت، (۲) نسب، (۳) طلب علم، (۴) حالات قبل خلافت، (۵) خلفائے بنو امیہ کے سامنے ان کی حق گوئی، (۶) خلافت، (۷) اخلاق و آداب، (۸) عقائد و مذہب، (۹) عدل و انصاف (۱۰) عمال کی نگرانی، (۱۱) بنو امیہ کا اون کے طریق عمل سے ناراض ہونا، (۱۲) لباس، (۱۳) خطبے اور وعظ، (۱۴) مسائل علمی کے متعلق ان کی رائیں۔

غرض اسی طرح اور بقیہ ابواب دلچسپ اور ضروری ہیں،

سوانح نویسی کے فرائض میں سے جو بڑا فرض مصنف سے رہ گیا ہے وہ تنقید ہے یعنی مصنف نے اپنے ہیرو کی صرف خوبیاں دکھائی ہیں، اس کے کسی قول و فعل پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کی ہے، لیکن یہ اس زمانہ کے تمام سوانح نگاروں کا انداز ہے، مورخین اسلام نے جو کتابیں عام فن تاریخ یا رجال پر لکھی ہیں، ان میں محاسن و معائب میں سے ہر واقعہ کا استقصا کیا ہے، لیکن خاص خاص اشخاص اور خصوصاً مقتدایان مذہب کے حالات میں جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں معائب کو قلم انداز کر دیا ہے، امام رازی نے امام شافعی کی جو سوانح عمری لکھی ہے، اس میں البتہ امام شافعی پر ہر قسم کے اعتراضات بھی نقل کئے ہیں۔ لیکن بیان واقعہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ جواب دینے کی غرض سے،

تاہم مصنفین اسلام آج کل کے فریب دہ طریقہ سے بالکل آشنا نہ تھے، آج کل سوانح نگاری کا یہ انداز ہے کہ حقیقت نگاری کے ظاہر کرنے کے لئے ہیرو پر نکتہ چینی کی جاتی ہے لیکن اس طرح کہ محاسن کو نہایت وسعت اور عمومیت کے ساتھ ہر پہلو سے دکھایا جاتا ہے پھر نہایت کمزور اور ضعیف الفاظ میں ایک آدھ اعتراض بھی بیان کر دیئے جاتے ہیں، جس سے دراصل مداحی کو اور قوت دینی مقصود ہوتی ہے کیونکہ اس سے یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے، کہ مصنف نے واقعہ نگاری کے لحاظ سے کسی واقعہ کو چھپانا نہیں چاہا ہے اور اس سے ممدوح کی چھوٹی سی چھوٹی برائی کا بھی ذکر کر دیا ہے، ورنہ ایسے محاسن اور خوبیوں کے مقابلہ میں ایک ذرا سی برائی بالکل نظر انداز کرنے کے قابل تھی، یہ طریقہ ہماری زبان کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے، اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں کا یہی انداز ہے لیکن یہ طریقہ قدیم طریقہ سے بہت زیادہ قابل اعتراض بلکہ خطرناک ہے، قدیم طریقہ صرف سکوت کا مجرم تھا، لیکن موجودہ طریقہ درحقیقت خیانت اور دغا ہے، جو واقعہ نگاری سے بہ مراحل دور ہے،

یہ ایک ضمنی بحث آگئی تھی، اب ہم اصل کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اس کتاب میں ایک بڑا عیب یہ بھی ہے، کہ صحیح اور ثابت شدہ واقعات کے ساتھ بعض لغو اور دور از کار قصے بھی نقل کئے ہیں، مثلاً یہ کہ عمر بن عبد العزیزؒ کی خلافت کی پیشین گوئی خضر علیہ السلام نے کی تھی، اور ہاتف نے ان کی خلافت کی خوشخبری دی، اور ان کا نام اگلی آسمانی کتابوں میں مذکور ہے،

یہ امر اس لئے زیادہ تعجب انگیز ہے کہ مصنف یعنی علامہ ابن جوزی ان محدثین میں ہیں، جو حدیث اور روایت کے بارہ میں آزاد خیال اور محتاط تھے، انہوں نے سیکڑوں حدیثوں کو جن کو لوگ مانتے چلے آتے تھے ضعیف اور موضوع ثابت کیا اور ہزاروں حدیثوں کی صحت سے انکار کیا، چنانچہ ان کا شمار متشددین میں کیا جاتا ہے، علامہ موصوف نے اس کتاب میں حضرت عمر بن عبد العزیز کے ان حالات کو جو خاص سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً ملکی لڑائیاں، فتوحات، بغاوتیں، عزل و نصب بالکل قلم انداز کر دیا ہے صرف ان باتوں کو لیا ہے جو زیادہ تر اون کے اخلاق، اور عدل و انصاف سے واسطہ

رکھتی ہیں، چنانچہ ہم چند واقعات کو اس موقع پر نقل کرتے ہیں، ان میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے واقعات اور حالات میں سب سے زیادہ جو چیز قابل لحاظ ہے وہ غیر مذہب والوں کے ساتھ ان کا طرز عمل ہے، عمر بن عبدالعزیز مذہب کی مجسم تصویر تھے، مذہبی حیثیت سے ان کو عمر ثانی کا لقب دیا گیا ہے، اس لئے غیر مذہب والوں کے ساتھ ان کا جو طرز عمل تھا وہ ان کی شخصی حالت نہیں بلکہ گویا مذہب اسلام کا اصلی طرز عمل ہے، ان واقعات میں سے ہم ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں،

ایک دن عمر بن عبدالعزیز مسند خلافت پر متمکن تھے، ایک عیسائی نے جو حمص کا رہنے والا تھا، دربار میں آکر یہ شکایت کی کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے بیٹے عباس نے میری زمین پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے، عمر بن عبدالعزیز نے عباس کی طرف دیکھا، عباس نے کہا، یہ زمین مجھ کو خلیفہ ولید نے بطور جاگیر کے عنایت کی تھی، چنانچہ اس کی تحریری سند میرے پاس موجود ہے، عمر بن عبدالعزیز نے عیسائی کیطرف مخاطب ہو کر کہا، تم کیا جواب دیتے ہو، اس نے کہا امیرالمومنین میں خدا کی تحریر (قرآن مجید) کے مطابق فیصلہ چاہتا ہوں، عمر بن عبدالعزیز نے عباس کیطرف مخاطب ہو کر کہا، عباس خدا کی تحریر تیرے باپ (ولید بن عبدالملک) کی تحریر پر مقدم ہے یہ کہکر وہ زمین عباس کے قبضہ سے نکال کر عیسائی کو دلا دی،

ان کا ایک اور کارنامہ جو نہایت قابل قدر ہے، سلاطین بنی امیہ کی ناجائز کارروائیوں کو مٹانا تھا، سلاطین بنی امیہ نے ملک کا بڑا حصہ جو زمینداری کی حیثیت سے رعایا کے قبضہ میں تھا، اپنے خاندان کے ممبروں کو جاگیر میں دے دیا تھا جس طرح سلاطین تیموریہ کے زمانہ میں بڑے بڑے صوبے شہزادوں کی جاگیر میں دے دیئے جاتے تھے، عمر بن عبدالعزیز تخت خلافت پر بیٹھے تو سب سے پہلے ان کو اس کا خیال ہوا، لیکن ایسا کرنا تمام خاندان خلافت کو دشمن بنا لینا تھا، تاہم انہوں نے اس کی کچھ پروا نہ کی،

اول اول جب انہوں نے یہ ارادہ کیا تو تمام خاندان نے ام عمر کو جو عمر بن عبدالعزیز کی پھوپھی تھیں سفیر مقرر کر کے بھیجا، انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس جاکر کہا کہ تمام خاندان برہم ہے اور مجھ کو ڈر ہے کہ عام بغاوت نہ ہو جائے اور لوگ ہنگامہ نہ کر دیں، عمر بن عبدالعزیز نے کہا میں قیامت کے سوا اور کسی دن سے نہیں ڈرتا، وہ مایوس ہو کر چلی آئیں۔

خود عمر بن عبدالعزیز کے قبضہ میں بھی اسی قسم کی جاگیریں تھیں، جو ان کے خاندان کو بنی امیہ کی طرف سے عنایت ہوئی تھیں، عمر بن عبدالعزیز نے جب ان جاگیروں کا فیصلہ کرنا چاہا، تو بڑے بڑے مذہبی علماء یعنی مکحول، میمون بن مہران اور ابو قلابہ کو بلایا اور کہا کہ ان جاگیروں کی نسبت آپ لوگوں کی کیا رائے ہے، مکحول نے دب کر جواب دیا، عمر بن عبدالعزیز نے میمون کی طرف رخ کیا کہ تم خدا لگتی کہو، انہوں نے کہا، اپنے صاحبزادہ عبدالملک کو بلا لیجئے، وہ آئے تو عمر بن عبدالعزیز نے کہا، کیوں عبدالملک! اس معاملہ میں تمہاری کیا رائے ہے، انہوں نے کہا سب واپس کر دینی چاہئیں ورنہ آپ کا شمار بھی انہیں ظالموں اور غاصبوں میں ہوگا،

عمر بن عبدالعزیز نے اپنے غلام سے جن کا نام مزاحم تھا، اور جن کو وہ بہت مانتے تھے، کہا کہ لوگوں نے جو زمینیں ہم کو دیں نہ وہ اس کے دینے کے مجاز تھے، نہ ہم کو ان کے لینے کا حق تھا، تمہاری کیا رائے ہے، مزاحم نے کہا امیرالمومنین! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کے بال بچے کتنے ہیں، یعنی ان کا گذر کیونکر ہوگا، عمر بن عبدالعزیز کے آنسو نکل آئے اور کہا، ان کا خدا مالک ہے، یہ کہکر گھر میں چلے گئے، مزاحم وہاں سے اٹھ کر عبدالملک (فرزند عمر بن عبدالعزیز) کے پاس گئے اور کہا بڑا غضب ہوا چاہتا ہے، عمر بن عبدالعزیز تمام خاندانی جاگیروں سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں، لیکن میں نے ان سے کہا کہ اپنی اولاد کا لحاظ کر لیجئے، عبدالملک نے کہا، استغفر اللہ تم نے بہت بری رائے دی، یہ کہہ کر عبدالملک عمر بن عبدالعزیز کے پاس گئے، وہ اس وقت خواب راحت میں تھے، پہرہ والے نے کہا کہ تم لوگ امیرالمومنین پر رحم نہیں کرتے، دن بھر میں ایک لحظہ تو ان کو آرام لینے دو، عبدالملک نے کہا تیری ماں مرے تو جا کر ان سے کہہ تو سہی، عمر بن عبدالعزیز کے کانوں میں یہ آواز پڑی، عبدالملک کو اندر بلا لیا، اور کہا جان پدر! یہ کون سا ملاقات کا وقت ہے، انہوں نے واقعہ بیان کیا، عمر بن عبدالعزیز نے کہا میں نماز ظہر کے بعد منبر پر چڑھ کر اس کا اعلان کر دوں گا، عبدالملک نے کہا اس کا ذمہ دار کون ہے، کہ آپ اس وقت تک زندہ رہیں گے، غرض اسی وقت عمر بن عبدالعزیز باہر آئے، شہر میں منادی کرا دی گئی کہ لوگ مسجد میں جمع ہوں، عمر بن عبدالعزیز نے منبر پر چڑھ کر کہا صاحبو! میں ان تمام زمینوں کو جو لوگوں نے ہمارے خاندان کو دی تھیں واپس کرتا ہوں، کیونکہ دینے والوں کو نہ دینے کا حق تھا نہ ہم کو لینے کا، یہ کہہ کر جاگیرات کی جو سندیں تھیں، صندوق سے نکلوائیں، اور قینچی سے کتر کتر کر ان کو پھینکنا شروع کیا، یہ جاگیریں کچھ یمن میں تھیں جن کا نام کیدس، جبل اور ورس تھا، کچھ یمامہ میں تھیں، چنانچہ سب سے پہلے ان زمینوں سے دست برداری ظاہر کی،

بنو امیہ نے یہ غضب کیا تھا کہ باغ فدک کو جس کو حضرت فاطمہ زہرا کے تقاضے پر بھی حضرت ابوبکرؓ نے اس بناء پر نہیں دیا کہ وہ عام مسلمانوں کا حق ہے، اپنا خالصہ بنا لیا تھا، عمر بن عبدالعزیز نے اس کو خاندان رسالت میں منتقل کر دیا، خاندان بنو امیہ میں ان کارروائیوں سے سخت برہمی پیدا ہوئی، سب نے متفق ہو کر ہشام بن عبدالملک کو عمر بن عبدالعزیز کے پاس بھیجا کہ اس فیصلہ پر نظر ثانی کریں اور قدماء جو فیصلہ کر گئے، اس کو بحال رکھیں، عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ اگر میرے سامنے ایک فرمان امیر معاویہ کا پیش کیا جائے، اور ایک عبدالملک کا تو مجھکو کس پر عمل کرنا چاہیے، ہشام نے کہا، جو مقدم ہو، عمر بن عبدالعزیز نے کہا تو خدا کا فرمان (قرآن) سب پر مقدم ہے

عمر بن عبدالعزیز کو تمام خاندان میں ابن سلیمان سے بہت محبت تھی، وہ اپنی جاگیر کی سند لیکر آئے کہ میری زمین آپ کیوں چھینتے ہیں، فرمایا کہ پہلے یہ زمین کس کے قبضے میں تھی، بولے کہ حجاج کے، فرمایا، تو حجاج کی اولاد کا حق ہے، تم کون ہوتے ہو، ابن سلیمان نے کہا اصل میں یہ زمین عام مسلمانوں کی تھی، عمر بن عبدالعزیز نے کہا، تو عام مسلمانوں کو ملنی چاہیئے، ابن سلیمان رونے لگے، مزاحم نے کہا، امیرالمومنین، آپ ابن سلیمان کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے ہیں، فرمایا ہاں میں ابن سلیمان کو اپنے بیٹے کے برابر چاہتا ہوں، لیکن میں خود اپنے نفس کے ساتھ یہی برتاؤ کرتا ہوں،

بنو امیہ کے دفتر اعمال میں سب سے زیادہ قوم کا برباد کرنے والا یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے آزادی اور حق گوئی کا استیصال کر دیا تھا، عبدالملک نے تخت پر بیٹھ کر حکم دیا تھا، کہ کوئی شخص میری کسی بات پر روک ٹوک نہ کرنے پائے اور جو شخص ایسا کرے گا، سزا پائے گا، اگرچہ اس پر بھی آزادی پسند لوگ کی زبانیں بند نہ ہوئیں، تاہم بہت کچھ فرق آگیا تھا، عمر بن عبدالعزیز نے اس بدعت کو بالکل مٹا دیا اور نہایت متدین اور راستباز شخص اس کام پر مقرر کیے کہ عدالت کے وقت ان کے پاس موجود رہیں، اور ان سے جو غلطی سرزد ہو فوراً ٹوک دیں، ان کے اس طرز عمل سے لوگوں کو عام طور پر جرأت ہو گئی تھی، اور لوگ نہایت بے باکی سے ان کے

افعال واقوال پر نکتہ چینی کرتے تھے،

آج کل مذہبی جوش اور مذہبی عصبیت کی یہ علامت خیال کی جاتی ہے کہ غیر مذہب کے لوگوں سے نفرت ظاہر کی جائے، اور جہاں تک ممکن ہو ان کی تحقیر اور تذلیل کی جائے، یہاں تک کہ اکثر فقہی کتابوں میں لکھا ہے، کہ عیسائیوں کو گھوڑے کی سواری کی اجازت نہ دینی چاہیئے، لیکن لوگوں کو حیرت ہوگی کہ عمر بن عبد العزیز جو ہمہ تن مذہب تھے، ان کا طرزِ عمل اس کے خلاف تھا، محدث ابن جوزی نے اسی کتاب میں بہ سند یہ واقعہ نقل کیا ہے، کہ مسلمہ بن عبد الملک جو خاندانِ بنی امیہ کا دست و بازو تھا، اس نے ایک گرجا کے متولیوں کے مقابلہ میں دعویٰ دائر کیا، فریقِ مقدمہ جو عیسائی تھے، اجلاس میں حسب قاعدہ کھڑے تھے، لیکن مسلمہ کو چونکہ خاندانی زعم تھا، اس لئے بیٹھ کر گفتگو کرتا تھا، عمر بن عبد العزیز نے کہا تمہارا فریق مقدمہ کھڑا ہے اس لئے تم بیٹھ نہیں سکتے، تم بھی اس کے برابر کھڑے ہو جاؤ، یا کسی اور کو مقرر کردو، جو تمہاری طرف سے مقدمہ کی پیروی کرے،

مقدمہ کا فیصلہ بھی مسلمہ کے خلاف کیا، یعنی زمین متنازعہ گرجا کے متولیوں کو دلادی، عمر بن عبد العزیز اکثر عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاں مہمان ہوتے تھے، لیکن ان کے کھانے کی قیمت دے دیا کرتے تھے، وفات کے وقت، اپنے مقبرہ کے لئے جو زمین پسند کی وہ ایک عیسائی کی تھی، اس کو بلا کر خریدنا چاہا، اس نے کہا امیر المومنین! قیمت کی ضرورت نہیں، ہمارے لئے تو یہ امر برکت کا باعث ہوگا، لیکن انھوں نے نہ مانا، اور تیس دینار دے کر وہ زمین خرید کی،

عمر بن عبد العزیز کی حکومت و سلطنت کا اصلی اصول مساوات، اور جمہوریت تھی، یعنی یہ کہ تمام لوگ یکساں حقوق رکھتے ہیں اور بادشاہ کو کسی پر کسی قسم کی ترجیح حاصل نہیں، صرف ملکی امور میں نہیں، بلکہ معاشرت اور خانگی زندگی میں بھی وہ اس کا لحاظ رکھتے تھے، ان کے کھانے کا یہ طریقہ تھا کہ عام مسلمانوں کے لئے جو لنگر خانہ تھا اس میں ایک درہم (۵/) روز بھیجدیا کرتے تھے، اور وہیں جاکر عام مسلمانوں کے ساتھ کھا لیتے تھے،

ایک دفعہ رات کے وقت مسجد میں گئے، ایک شخص مسجد کے صحن میں لیٹا ہوا تھا، اتفاق سے عمر بن عبد العزیز کے پاؤں کی ٹھوکر اس کو لگی، اس نے جھلا کر کہا کیا تو پاگل ہے، عمر بن عبد العزیز نے کہا کہ نہیں، پولیس کے آدمی موجود تھے، انہوں نے اس شخص کو گستاخی کی سزا دینی چاہی، عمر بن عبد العزیز نے کہا کیوں؟ اس نے کیا گناہ کیا ہے، اس نے تو صرف استفسار کیا تھا، کہ کیا تم پاگل ہو؟ میں نے کہہ دیا نہیں

عمر بن عبد العزیز کے صاحب زادوں میں سے عبد الملک بالکل اپنے باپ کا نمونہ تھے، اور اس بنا پر ان سے نہایت محبت رکھتے تھے، ایک دن عمر بن عبد العزیز نے میمون بن مہران کو بلا کر کہا کہ میں عبد الملک کو بہت اچھا سمجھتا ہوں، لیکن غالباً یہ مہر پدری کا اثر ہے، ذرا تم جاکر آزماؤ، تمہاری کیا رائے قائم ہوتی ہے، وہ عبد الملک کے پاس گئے، باتیں ہو رہی تھیں، کہ عبد الملک کے غلام نے آکر کہا کہ میں نے انتظام کر دیا میمون نے پوچھا کیا؟ عبد الملک نے کہا میں نے اس کو حکم دیا تھا کہ حمام میرے نہانے کے لئے خالی کرادو، میمون نے کہا، اللہ اکبر! میرا خیال تمہاری نسبت بہت اچھا تھا، لیکن اب میرے خیال میں فرق آگیا، تم کو اس کا کیا حق حاصل ہے کہ حمام کو اپنے لئے خاص کر لو، اور عام لوگوں کو نہانے سے روک دو، عبد الملک نے کہا میں نے تمام دن کا کرایہ ادا کر دیا ہے، میمون نے کہا تو یہ شیخیت پناہی اور فضول خرچی ہے تم عام مسلمانوں کے برابر ہو، انھوں نے کہا کیا کروں! لوگ حمام میں ننگے نہاتے ہیں! اس لئے میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتا، میمون نے کہا تو رات کو نہایا کرو، عبد الملک نے کہا آئندہ ایسا ہی کروں گا،

عمر بن عبد العزیز جب مرنے لگے تو مسلمہ بن عبد الملک نے کہا کہ وصیت کر جایئے، کہا میرے پاس کیا ہے، جس کی وصیت کروں، مسلمہ نے کہا میں ایک لاکھ روپیہ بھیجے دیتا ہوں، جس کو چاہیئے اس میں سے وصیت کیجئے، فرمایا، کہ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ یہ رقم جن لوگوں سے وصول کی ہے ان کو واپس دیدو، مسلمہ یہ سنکر بے اختیار رو پڑے

اس سلسلہ میں یہ امر بیان کرنے کے قابل ہے، کہ خلفائے بنی امیہ کی دولت مندی کا یہ حال تھا کہ جب ہشام بن عبد الملک نے وفات کی تو اس کے ترکہ میں سے صرف اولادِ ذکور کو جسقدر نقد رقم وراثت میں ملی، اس کی تعداد ایک کروڑ دس لاکھ تھی، لیکن عمر بن عبد العزیز نے جب وفات پائی تو کل ۱۷ دینار چھوڑے جس میں تجہیز و تکفین کے مصارف ادا کرنے کے بعد دس دینار بچے جو ورثہ پر تقسیم ہوئے، غرض عمر بن عبد العزیز کی خلافت اور سلطنت ٹھیک اسی اصول کا نمونہ تھی جو اسلام نے قائم کیا تھا، اور جس کو سلاطین بنی امیہ و عباسیہ میں تلاش کرنا بالکل بے فائدہ ہے، یہ لوگ در حقیقت خلیفہ نہ تھے، بلکہ کسریٰ و قیصر تھے،

(الندوہ ج ۱ نمبر ۵ ماہ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ)

بلاغات النساء

تیسری صدی ہجری کی ایک تصنیف ہے، جس میں عورتوں کی تقریریں اور خطبے جمع کئے ہیں، قدماء کی تصنیفات کی گمشدگی کی وجہ سے اسلامی تمدن، اسلامی اخلاق بلکہ خود شریعتِ اسلام کی جو تصویر ہمارے پیشِ نظر ہے، اس قدر اصلیت سے دور ہے کہ صحیح خد و خال کا تصور کرنا بھی آج مشکل ہے، فرض کرو جو کتابیں ہمارے پیشِ نظر ہیں، جو روائتیں تم سنتے آئے ہو، جو حالات آنکھوں کے سامنے ہیں، ان سے یہ پتہ لگاؤ، کہ اسلام میں جنسِ نازک کا کیا درجہ تھا، تو یہ جواب نظر آئے گا کہ ملکی معاملات میں، نظم و نسق میں شاہی دربار میں، مناظروں کے معرکوں میں، اس جنسِ لطیف کا گذر تک نہیں، اگر تم سے یہ کہا جائے کہ حضرت علی اور امیر معاویہ میں جو قیامت انگیز معرکے ہوئے ان میں خاندانی عورتیں اونٹوں پر سوار میدانِ جنگ میں پرجوش تقریریں کرتی پھرتی تھیں اور ان کی پُر اثر تقریریں دلوں میں آگ لگا دیتی تھیں، تو کس کو یقین آئے گا؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس معرکہ میں متعدد عورتیں تھیں جو رجز خوانوں، مقرروں اور کرشکیتوں کا کام دیتی تھیں اور جن کی وجہ سے معرکۂ جنگ سرد ہو ہو کر گرم ہو ہو جاتا تھا،

کس کو خیال تھا، کہ عورتیں بھی کسی زمانہ میں یہ پوزیشن (درجہ) رکھتی تھیں کہ ان کی تقریریں اور گفتگوئیں قلم بند اور مدون کی جائیں، لیکن اس وقت ہمارے سامنے جو کتاب ہے، اور جو ہمارے مضمون کا عنوان ہے وہ اسی خاص موضوع پر ہے،

یہ کتاب قریباً گیارہ سو برس کی تصنیف ہے، مصنف کا نام احمد بن ابی طاہر بغدادی ہے، جو ۲۰۴ھ میں پیدا ہوا، اور جس نے سب سے پہلے بغداد کی تاریخ لکھی، یہ کتاب مصر میں چھپ کر شائع ہوئی ہے، ضخامت ۲۰۰ صفحوں کی ہے اور چونکہ عبارت بہت مشکل ہے، اس لئے ہر جگہ کثرت سے حاشیے چڑھائے ہیں،

قدما کا طرز تھا، کہ واقعہ کو مسلسل اور متصل روایت کے ذریعہ سے بیان کرتے تھے اور یہ طرز حدیث کے ساتھ مخصوص نہ تھا، یہ کتاب بھی اسی التزام سے لکھی گئی ہے، اس سے یہ فائدہ ہے کہ کبھی روایت میں شک ہو، تو اس کی کافی تحقیق ہو سکتی

ہے، سب سے پہلے اس کتاب میں حضرت عائشہؓ کا وہ خطبہ (لکچر) نقل کیا ہے، جو انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے فضائل میں دیا تھا، پھر حضرت فاطمہ زہراؓ، اور حضرت حفصہؓ کے خطبے ہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ خطبے اعتبار کے قابل نہیں خطبوں میں وہ الفاظ اور وہ خیالات، اور وہ طرز ادا پایا جاتا ہے، جو اس زمانہ میں سرے سے پیدا نہیں ہوا تھا مثلاً حضرت فاطمہؓ کے خطبہ میں خدا کی نسبت یہ الفاظ ہیں،

الممتنع من الابصار رؤیتہ ابتدع — اس کا آنکھوں سے دیکھا جانا ممتنع ہے،
الاشیاء لا من شئ قبلہ — اس نے تمام چیزوں کو عدم محض سے پیدا کیا

یہ ظاہر ہے کہ یہ معتزلہ اور اہل فلسفہ کے متنازع فیہ مسائل ہیں، معتزلہ کہتے ہیں کہ خدا کا دیکھا جانا محال ہے، برخلاف اس کے اہل سنت و جماعت اس کے جواز کے قائل ہیں، اہل فلسفہ اس بات کے قائل ہیں، کہ خدا نے عالم کو مادہ سے پیدا کیا، لیکن مسلمانوں کا عموماً یہ مذہب ہے، کہ خدا نے دنیا کو بغیر کسی سابق مادہ کے پیدا کیا عجیب بات یہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ کے اس قسم کے خطبے جن میں ہیولیٰ تک کا لفظ موجود ہے، شیعہ علماء کی تمام مستند کتابوں میں منقول ہیں،

حضرت فاطمہؓ و زینبؓ اور ام کلثومؓ کے خطبہ کے بعد مصنف نے اُن عورتوں کے خطبے نقل کئے ہیں، جو حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے معرکوں میں شریک تھیں، ان خطبوں کے ساتھ ان کے متعلق مزید حالات بھی بیان کئے ہیں جن کو ہم دلچسپی کے لحاظ سے نقل کرتے ہیں،

زرقا ایک عورت تھی، جو معرکہ صفین میں شریک تھی، ایک دن امیر معاویہ نے قصہ خوانی کے وقت مصاحبین سے کہا، کہ کسی کو زرقا کا لکچر (خطبہ) بھی یاد ہے، حاضرین نے کہا ہم سب کو یاد ہے، امیر معاویہ نے کہا، اس کی نسبت تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟ سب نے کہا قتل، امیر معاویہ نے کہا، کیا یہ مناسب ہے، کہ ایک عورت کو قتل کر ڈالیں یہ کہکر کوفہ کے عامل کو لکھا کہ زرقا کو اس کے عزیزوں کے ساتھ بھیج دو، چند سوار بھی اس کے جلو میں ساتھ ساتھ آئیں، عامل نے حکم کی تعمیل کی، اور امیر معاویہؓ کا خط زرقا کو دیا، زرقا نے کہا اگر میری مرضی پر مجھ کو چھوڑ دیا جائے تو مجھ کو جانا منظور نہیں لیکن حکم ہے، تو چلتی ہوں، عامل نے ایک اونٹ سواری کے لئے پیش کیا جس کا محمل یمنی چادر سے منڈھا ہوا تھا، زرقا بڑی عزت اور احترام سے دربار میں آئی، امیر معاویہؓ نے مزاج پرسی کے بعد کہا "کیوں وہ موقع یاد ہے؟ جب تو سرخ رنگ اونٹ پر چڑھ کر لوگوں کو لڑائی پر آمادہ کرتی پھرتی تھی، زرقا نے کہا، امیر المؤمنین! گئی گذری بات ہوئی یہ زمانہ کا رنگ ہے، آج یہ حالت ہے، کل خدا جانے کیا ہوگا"

امیر معاویہ نے کہا اپنا وہ خطبہ بھی یاد ہے، زرقا نے کہا نہیں، امیر معاویہ نے کہا "لیکن مجھکو یاد ہے اور وہ یہ ہے"

اس کے بعد مصنف نے پورا خطبہ نقل کیا ہے، لیکن ہم نے اس لحاظ سے نقل نہیں کیا کہ افسوس یہ ہے، کہ ترجمہ میں زور نہیں قائم رہتا، اور بیچ بیچ میں سے اکثر جملے چھوڑ دیئے ہیں، کہ ناظرین عربی داں کہتے ہیں اور ترجمہ میں خطبہ کا لطف نہیں قائم رہ سکتا، (الندوہ ج ۶ نمبر ۸ شعبان ۱۳۲۹ھ)

یورپ کا ایک اور علمی احسان، عمر خیام کا جبر و مقابلہ

عمر خیام کو ہم جس حیثیت سے جانتے اور پہچانتے تھے، وہ یہ تھی کہ وہ شاعر ہے، رباعی گو ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ آج کل کے مذاق کے موافق آزاد خیال ہے، تاریخوں اور تذکروں میں اس کی ریاضی دانی کا ذکر ضرور ہے، لیکن ہمارے خیال میں وہ اسی قسم کی بات تھی کہ علامہ ابن الہمام شارح ہدایہ موسیقی بھی جانتے تھے لیکن یورپ کی بدولت آج ہم کو عمر خیام کی وہ کتاب ہاتھ آئی جس سے اس کے ریاضی دان اعظم ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

مسلمانوں نے خود کبھی دعویٰ نہیں کیا، کہ وہ علم جبر و مقابلہ کے موجد ہیں، لیکن اس فن میں ان کی اس قدر اکتشافات (ڈسکوریز) ہیں کہ اس نام سے ان کی عام شہرت ہو گئی ہے، اس فن میں سب سے پہلے ابوموسیٰ خوارزمی نے ایک کتاب لکھی، عربی داں تو اس سے آج بھی ناواقف ہیں، لیکن انگریزی میں مدت ہوئی اس کا ترجمہ ہو گیا، اور اصل عربی کے ساتھ چھپ کر شائع ہوا، چنانچہ ہماری نظر سے بھی گذر چکا ہے، ابوموسیٰ کے بعد، اور لوگوں نے بھی اس فن میں کتابیں لکھیں، اور غالباً سب سے اخیر مجتہدانہ کتاب عمر خیام کا جبر و مقابلہ ہے، جو اس وقت ہمارے سامنے ہے عمر خیام کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے، کہ قدماء کی کوئی تصنیف اس کو نہیں ملی تھی، ہندوستان کے ریاضی دانوں نے البتہ کچھ قاعدے لکھے تھے، لیکن وہ محض ابتدائی باتیں تھیں، چنانچہ دیباچہ میں لکھتا ہے،

اما المتقدمون فلم یصل الینا منهم — باقی قدماء تو ان کا کوئی کلام ہم تک نہیں پہنچا.
کلام لعلهم لم یتفطنوا لها بعد — شاید ان کا ذہن باوجود غور و فکر کے اس
الطلب والنظر او لم یضطر البحث — میں کامیاب نہیں ہوا، یا ان کو اس کی
ایاهم او لم ینقلها الی لساننا — ضرورت پیش نہیں آئی، یا ان کی تصنیفات
کلامهم فیها، — کا ترجمہ ہماری زبان میں نہیں ہوا،

ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے،

وللهند طرق فی استخراج اضلاع — اور ہندیوں کے یہاں مربعات اور
المربعات والمکعبات مبنیة — مکعبات کے اضلاع کے نکالنے کے طریقے
علی استقراء قلیل، — ہیں، جو تھوڑے سے استقراء پر مبنی ہیں،

خیام نے ہندی قواعد کے اثبات پر ایک مستقل کتاب لکھی، جس کا حوالہ اس کتاب میں دیا ہے۔

خیام اس فن کی ترقی کی جو تاریخ بیان کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ماہانی نے اس اصول کی تحلیل جبر و مقابلہ کے ذریعہ سے کی جس کو ارشمیدس نے کتاب الکرة والاسطوانة کے مقالہ ثانیہ کی شکل رابع میں استعمال کیا ہے، اس سے کعب، مال، اعداد متعادلہ پیدا ہوئے، لیکن وہ ان کو حل نہ کر سکا، اور بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ یہ ناممکن ہے، لیکن ابوجعفر خازن نے قطوع مخروطی کے ذریعہ سے اس کو حل کیا، اس کے بعد اور ہندسہ دانوں نے اس پر توجہ کی اور بعض بعض مسائل حل کئے،

خیام نے اس فن میں جو اضافہ کیا، اس کی تفصیل دیباچہ میں کی ہے اور بتایا ہے، کہ فلاں فلاں قاعدے میں، میں نے یہ اضافہ کیا، اس کے ساتھ چھ اصول کی نسبت لکھا ہے، کہ دوسرے سے کسی قدیم تصنیف میں موجود ہی نہ تھے وہ یہ ہیں،

(۱) وہ کعب اور جذر جو عدد کے معادل ہو،
(۲) وہ کعب اور عدد جو جذر کے معادل ہو،
(۳) وہ عدد اور جذر جو کعب کے معادل ہو،
(۴) وہ کعب اور مال جو عدد کے معادل ہو۔

---

[1] یہ کتاب فرانس کے دارالسلطنت پیرس میں معہ ترجمہ کے چھاپی گئی ہے اور ۲ روپئے قیمت ہے

۵ ۔ وہ کعب اور عدد جو مال کے معادل ہو،
۶ ۔ وہ عدد اور مال جو کعب کے معادل ہو،

ان سب کو خیام نے قطوع مخروطی کے خواص سے ثابت کیا ہے،

افسوس ہے کہ مجھ کو فن جبر و مقابلہ میں دخل نہیں ہے کہ میں اس کتاب پر ریویو کر سکوں فرنچ میں اس کتاب کا جو ترجمہ ہے، اس کے دیباچہ میں تفصیلی ریویو لکھا ہے، لیکن ہمارے ملک میں فرنچ کتنے آدمی جانتے ہیں۔ (الندوہ ج ۶، نمبر ۸، شعبان ۱۳۲۷ھ)

تجارب الامم ابن مسکویہ

گب موریل سیریز

یورپ کی علمی فیاضیوں کا ذکر ہم نے اس قدر بار بار کیا ہے کہ اس عنوان پر ہم اگر کچھ اور کہنا چاہیں تو لوگ فوراً بول اٹھیں گے کہ ؎

این آں فسانہ ایست کہ صد بار گفتہ

لیکن اگر ہر نئے احسان کا نیا شکر واجب ہے تو یہ ذکر کرنا پڑیگا، اور بار بار کرنا پڑیگا، انصاف کرو مسلمان، دنیا کے ہر حصہ میں پھیلے ہوئے ہیں، ان کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہیں، اپنے علوم و فنون کی قدر دانی کا جس قدر ان کو دعویٰ ہے، شاید کسی قوم کو نہ ہوگا، لیکن کیا یورپ نے عربی زبان کی جو خدمت کی ہے، اس کا ہزارواں حصہ بھی آج اسلام کی وسیع دنیا کر سکتی ہے، یورپ نے جس قسم کی نادر اور نایاب عربی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کیں، کیا ایک بھی اس قسم کی کتاب مسلمانوں نے شائع کی؟ معجم البلدان، بلاذری طبری، یعقوبی، ابن بدیع ہمدانی، تاریخ الحکما قفطی، طبقات ابن سعد، انساب الاشراف، معارف داور اس قسم کی سیکڑوں کتابوں، کو کس نے دنیا میں روشناس کیا؟ اور سچ تو یہ ہے، کہ اب بھی کتنے مسلمان ان کتابوں سے واقف ہیں،

یورپ کی علمی فیاضی کی داستان نہایت طویل ہے، یہاں ہم کو اس میں سے صرف گب سیریز کا تذکرہ کرنا ہے، جو ہمارے مضمون کی دوسری سرخی ہے گب ایک دولتمند انگریز تھا جس نے کئی لاکھ روپیہ صرف اس لئے وقف کر دیا کہ اس سے عربی اور فارسی زبان کی نایاب تصنیفات ڈھونڈ کر شائع کی جائیں، چنانچہ اس وقت تک جو کتابیں اس سلسلہ میں شائع ہوئیں وہ حسب ذیل ہیں۔

بابر نامہ یعنی تزک بابری، جس میں بابر شاہ نے خود اپنے حالات لکھے ہیں،
ترجمۂ تاریخ طبرستان، از اسفندیار،
تاریخ خاندان رسولیہ یمنی از خزرجی،
سفر نامۂ ابن جبیر اندلسی،
معجم الادبار یاقوت حموی، نہایت نایاب تھی قسطنطنیہ میں ایک ناتمام نسخہ تھا، اب تک اس کتاب کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں،
تجارب الامم ابن مسکویہ، اس کی مفصل کیفیت آگے آتی ہے،

یہ وہ کتابیں ہیں جو شائع ہو چکیں، اور جو کتابیں اس سلسلہ میں زیر طبع ہیں، یا جن کا چھاپنا مقصود ہے وہ حسب ذیل ہیں،

معجم فی معیار اشعار العجم، فن عروض میں ہے، اس کا مصنف شیخ سعدی کا معاصر تھا کتاب کا سنہ تصنیف ۶۱۴ھ ہے، اس کا قلمی نسخہ ہمارے کتب خانہ میں موجود ہے،
تاریخ مغول از رشید الدین فضل اللہ،
ترجمہ تاریخ سیستان،
حصہ جغرافیہ از کتاب نزہۃ القلوب حمد اللہ المستوفی،
چہار مقالہ عروضی سمرقندی،
مرزبان نامہ
فتوح مصر و المغرب والاندلس، از ابو القاسم عبد الرحمان،
تاریخ مصر از کندی نہایت قدیم تاریخ ہے،
قابوس نامہ
انساب سمعانی، نہایت مستند اور نادر کتاب ہے،
کتاب الرد علی اہل البدع والاہواء للفشتی،

ان کے علاوہ اور چند کتابیں ہیں جن کا ذکر چنداں ضروری نہیں،

اس سلسلہ کا نام گب موریل سیریز ہے، اور اس میں سے ہم اس وقت تجارب الامم سے بحث کرنی چاہتے ہیں، جو ہمارے مضمون کا پہلا عنوان ہے،

اس کتاب کا مصنف علامہ ابن مسکویہ ہے، جو مشہور حکیم اور فلاسفر تھا، اس کی کتاب الطہارۃ جس سے امام غزالی نے احیاء العلوم میں اکثر موقعوں پر فائدہ اٹھایا ہے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، الہیات میں اس کی کتاب فوز الاصغر نہایت اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے اور جس قدر اسلامی تصنیفات اس موضوع پر ہماری نظر سے گذر چکی ہیں ان میں سے ایک بھی اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی، ابن مسکویہ عضد الدولہ اور اس کے جانشینوں کے دربار میں نہایت معزز منصب پر ممتاز تھا، اس نے ۴۲۱ھ میں وفات پائی،

اس کتاب کا نسخہ جو یورپ نے بہم پہنچایا ۶۱۰ھ کا لکھا ہوا ہے۔ مزید اطمینان کے لئے یورپ نے اصل نسخہ کو فوٹو کے ذریعہ سے شائع کیا، لیکن اس سے یہ نقصان ہوا، کہ چونکہ قدیم زمانے کا یہ خط ہے، اس لئے کہیں کہیں یہ پڑھا نہیں جاتا، جا بجا حرف بھی اڑ گئے ہیں، اور سیاہی مٹ چکی ہے، اڈیٹر نے مختصر سا دیباچہ انگریزی میں لکھا ہے، اور ایک نہایت مفصل فہرست اسماء اور مقامات کی شامل کی ہے، کتاب بمقام لیڈن ۱۹۰۹ء میں چھاپی گئی ہے،

اس کتاب پر ہم مختلف حیثیتوں سے ریویو کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) ہمارے یہاں علوم کی جو دو قسمیں معقول و منقول قرار دی گئیں، اس کے متعلق ایک سخت غلطی یہ ہوئی کہ بعض علوم جن میں دونوں حیثیتیں جمع تھیں، صرف ان میں ایک حیثیت کا لحاظ ہوا، مثلاً تاریخ و روایت کا فن محض منقولات میں شمار کیا گیا، جس سے نتائج ذیل پیدا ہوئے،

(۲) جو لوگ صرف معقول کو اپنا مایۂ ناز سمجھتے تھے، یعنی حکماء اور فلاسفر انہوں نے اس فن کی طرف مطلق توجہ نہیں کی، اس لئے یہ فن فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں سے محروم رہ گیا یہی وجہ ہے کہ بوعلی سینا فارابی، محقق طوسی، امام رازی، قطب الدین شیرازی، جلال الدین دوانی کی کوئی تصنیف اس فن میں موجود نہیں،

(۳) چونکہ اس فن کی نسبت عام خیال یہ پیدا ہو گیا، کہ اس کو عقل و درایت سے تعلق نہیں اس لئے مورخین اور اہل روایت نے خود بھی عقل اور درایت سے کام نہیں لیا، ان کو صرف اس سے غرض تھی، کہ واقعہ کا بیان کرنے والا ثقہ ہے، یا نہیں! اگر ثقہ ہے، تو وہ جو واقعہ بیان کرتا ہے ان کے نزدیک قابل اعتبار ہے، حالانکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ راوی ثقہ ہو، اور واقعہ کے بیان میں اس سے غلطیاں وقوع میں آئیں، غرض اس خیال کی وجہ سے تاریخ کا فن اس رتبہ پر نہ پہنچا جس پر اس کو پہنچنا چاہئے تھا،

اس عالم میں ابن مسکویہ ایک مستثنیٰ شخص نظر آتا ہے، جس نے فلسفی اور حکیم ہو کے

ساتھ فن تاریخ پر بھی توجہ کی، ابن مسکویہ کے نام سے ہر شخص کو امید پیدا ہو سکتی ہے، کہ اس کی تاریخ عام شاہراہ سے الگ ہو گی، اور ہم خوش ہیں کہ یہ امید ناکامیاب نہیں ہوئی، ابن مسکویہ نے کتاب کے دیباچہ میں تاریخ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ وہ اس فن کو کس نظر سے دیکھتا ہے، اور اس کو کس انداز سے لکھنا چاہتا ہے، یورپ میں آج کل فن تاریخ کو اس قدر ترقی ہوئی ہے کہ کبھی نہ ہوئی ہو گی، تاریخی واقعات کے ساتھ اس قدر اعتنا کیا جاتا ہے کہ ایک ایک جزئی واقعہ، اور ہر واقعہ کی ہر قسم کی جزئی خصوصیات کا استقرا کیا جاتا ہے، لیکن اہل فلسفہ کے نزدیک یہ ایک علمی بے اعتدالی ہے، تاریخ کا مقصد ان واقعات کا پتہ لگانا ہے، جن سے خاص نتائج پیدا ہوتے ہیں، اور جن سے علت و معلول کا اس طرح سلسلہ قائم ہوتا ہے کہ جب اسی قسم کے واقعات پیش آئیں تو فوراً پیشین گوئی کی جا سکے کہ اسی قسم کے نتائج پیش آئینگے اس سے زیادہ جو کچھ ہے وہ یا قصہ ہے، یا بیکار واقعات ہیں، چنانچہ ہربرٹ اسپنسر نے تفصیل کے ساتھ اس نکتہ کو لکھا ہے،

ہمارا فلسفی مورخ (ابن مسکویہ) بھی تاریخ کو اسی نظر سے دیکھتا ہے، وہ دیباچہ میں لکھتا ہے۔

انی لما تصفحت اخبار الامم وسير الملوك وقرأت اخبار البلدان وكتب التواريخ وجدت فيها ما يستفاد منه تجربة في امور لا تزال تتكرر مثلها وينتظر حدوث مثلها فان امور الدنيا متشابهة واحوالها متناسبة

میں نے جب قوموں کے حالات اور سلاطین کے تذکرے بغور دیکھے اور شہروں کے حالات اور تاریخ کی کتابیں پڑھیں تو میں نے ان میں وہ باتیں پائیں جن سے ان امور کے متعلق تجربہ حاصل ہوتا ہے جن کے مثل واقعات عموماً پیش آیا کرتے ہیں اور انکے پیش آنے کی توقع ہوتی ہے، کیونکہ دنیا کے واقعات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، اور اس کے واقعات میں باہم تناسب ہے،

اس کے بعد لکھتا ہے،

ووجدت هذا النمط من الاخبار مغمورا بالاخبار التي تجري مجرى الاسمار والخرافات التي لا فائدة فيها غير استجلاب النوم بها والاستمتاع بالانس المستطرف منها

اور میں نے دیکھا کہ اس قسم کے واقعات ان باتوں کے ساتھ رل مل گئے ہیں جو محض قصہ اور خرافات کے کام کے ہیں، جن سے بجز اس کے کوئی فائدہ نہیں کہ ان کے سننے سے نیند آتی ہے یا ان کے اعجوبہ نما واقعات سے لطف آتا ہے،

ابن مسکویہ نے اس کا سخت افسوس کیا ہے، کہ تاریخ کا فن اپنے اصلی مرکز سے ہٹ گیا ہے، اور لوگوں کی توجہ عموماً ان واقعات کی طرف ہے، جو علت و معلول کے سلسلہ قائم کرنے میں کچھ مدد نہیں دیتے، اس کا یہ نتیجہ ہوا، کہ جو نتیجہ انگیز واقعات تھے، ان کی طرف خاص نگاہ نہیں پڑتی، اور وہ بھی انہیں عام اور بے نتیجہ واقعات میں شامل ہو کر بیکار ہو جاتے ہیں، چنانچہ لکھتا ہے،

حتى ضاع بينها وتبدد فصار اشتاتا فبطل الانتفاع بها ولم يتصل لسامعه وقارئه اتصالا يربط بعضه ببعض

یہاں تک کہ یہ اصلی واقعات، ان لغو واقعات میں رل مل کر برباد ہو گئے اور اس لئے ان سے فائدہ اٹھانا نہ ہو سکا، اور پڑھنے اور سننے والے کو ان واقعات میں ایسا سلسلہ نہیں ملتا، جس سے تمام واقعات ایک دوسرے سے مربوط ہو جائیں،

اس کے بعد لکھتا ہے،

فلذلك جمعت هذا الكتاب واكثر الناس انتفاعا به واكبرهم حظا منه واوفرهم قسطا من الدنيا كالوزراء واصحاب الجيوش وسواس المدن

اس لئے میں نے یہ کتاب مدوّن کی، اور اس کتاب سے زیادہ تر فائدہ وہ لوگ اٹھا سکتے ہیں جن کو دنیوی معاملات سے زیادہ تر تعلق ہے، مثلاً وزرا اور فوج کے افسر اور مدبرین ملک،

مصنف نے تمام کتاب میں اس مقصد کو پیش نظر رکھا ہے، اور جو واقعات، اس مقصد سے تعلق نہیں رکھتے، ان کو عموماً نظر انداز کرتا جاتا ہے، اس مقصد کو اس نے اس قدر پیش نظر رکھا ہے کہ انبیاء کے حالات میں معجزات کا ذکر نہیں کرتا کیونکہ اس کے نزدیک معجزات، علت و معلول کے سلسلے سے الگ ہیں، چنانچہ لکھتا ہے،

ولهذا السبب بعينه لم نتعرض لذكر معجزات الانبياء صلوات الله عليهم لان اهل زماننا لا يستفيدون منها تجربة فيما يستقبلونه من امورهم الا ما كان منها تدبيرا بشريا لا يقترن بالاعجاز

اور اسی سبب سے میں نے انبیا علیہم السلام کے معجزات کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ آج کل کے لوگ ان سے آیندہ واقعات کی نسبت کوئی تجربہ نہیں حاصل کر سکتے البتہ وہ واقعات میں نے لکھے ہیں، جو انبیاء سے انسانی تدبیر کی حیثیت سے وقوع میں آئے ہیں جن میں معجزہ کی آمیزش نہیں ہے

۲:- ایران کی تاریخ میں، دور از کار واقعات کثرت سے ہیں، اور فردوسی کی شاعرانہ رنگ آمیزی نے تو تاریخ کو ناول بنا دیا، ابن مسکویہ ان وہمی افسانوں کی نسبت ہر جگہ تصریحات کرتا جاتا ہے، کہ ایرانیوں کی خرافات ہیں، اور بعض جگہ بتاتا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا، اور الفاظ کے غلط استعمال اور لوگوں کی وہم پرستی سے اس کی صورت بدل گئی، مثلاً ایک موقع پر لکھتا ہے،

فللفرس ههنا خرافات وتزعم ان الشياطين كانت مسخرة له كيفما يوس)

اور ایرانی اس موقع پر بہت سے خرافات بیان کرتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں، کہ شیاطین کیکاؤس کے مسخر تھے،

ضحاک کی نسبت تمام ایرانی تاریخوں میں مذکور ہے کہ اس کے کاندھے پر دو سانپ تھے، جن کی غذا آدمی کا دماغ تھا، ابن مسکویہ اس واقعہ کی نسبت لکھتا ہے،

وكان على منكبه سلعتان يحركهما اذا شاء كما يحرك يديه فادعى انهما حيتان تهويلا على ضعفاء الناس واغبيائهم وكان يسترهما بثيابه

اور اس کے شانوں پر دو غدود تھے، جن کو وہ جب چاہتا تھا، حرکت دے سکتا تھا، جس طرح اپنے ہاتھوں کو حرکت دے سکتا تھا، ضحاک نے یہ ظاہر کیا کہ یہ دونوں سانپ ہیں جس سے اس کا مقصد عوام اور احمقوں کو مرعوب کرنا تھا اور وہ انکو لباس کے اندر چھپائے رکھتا تھا

طغمورث کی نسبت عام طور پر مشہور ہے، کہ شیطان اور جن اس کے مسخر تھے، اور اسی کے یہاں عمارت وغیرہ کا کام کرتے تھے، ابن مسکویہ اس واقعہ کی حقیقت اس طرح ظاہر کرتا ہے،

وطلب الدعار ونفی الشیاطین اعنی الاشرار والزم من عنده من اهل الفساد والشیاطین الاعمال الصعبة واذلهم لقطع الحجارة والصخور من الجبال۔

اس نے بدچلن لوگوں کو جلایا، اور شیاطین یعنی بدمعاشوں کو ملک سے نکال دیا، اور اس نے مفسدوں اور شیطانوں کو سخت کاموں پر مامور کیا، اور ان کو سنگتراشی کے کام پر لگایا،

۳:- ایران کے لٹریچر میں بعض چیزیں ایسی تھیں، جو دنیا کی بہترین یادگار سمجھی جاتی تھیں، مثلاً نوشیرواں کا کارنامہ جو خود اس نے لکھا تھا، یا اردشیر کا عہد نامہ جس کو مورخین عرب منجملہ ان چاروں کتابوں کے شمار کرتے ہیں، جب سے مثل تسلیم کی گئی ہوں، ابن مسکویہ نے ان چیزوں کی پوری قدردانی کی ہے، چنانچہ ان دونوں کا ایک ایک حرف دعربی ترجمہ کے ذریعہ سے، نقل کیا ہے، نوشیرواں کا ایک لکچر جو اس نے تمام امرا اور خواص وعوام کے مجمع میں دیا تھا، اور جس میں انتظامات ملک کے تمام نکتے بتائے ہیں اس کا بھی پورا ترجمہ کیا ہے،

۴:- ابن مسکویہ نے اکثر واقعات شاہ نامہ کے خلاف لکھے ہیں، اور اکثر ان واقعات کا سرے سے ذکر نہیں کیا ہے، جو شاہ نامہ کے مشہور معرکے ہیں، مثلاً رستم وسہراب کی داستان، رستم واسفندیار کی جنگ، منیژہ وبیژن کا واقعہ، شاہ نامہ میں لکھا ہے کہ کیکاؤس کو شاہ مازندران نے گرفتار کر لیا تھا، لیکن ابن مسکویہ نے اس واقعہ کے بجائے لکھا ہے کہ کیکاؤس جب یمن پر حملہ آور ہوا، تو ذوالاذعار بادشاہ یمن نے اس کو شکست دی اور ایک کنوئیں میں قید کر دیا، بالآخر رستم گیا اور اس کو چھڑا لایا،

ان واقعات کے متعلق یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے، کہ ابن مسکویہ اور فردوسی دونوں میں سے کس کا بیان صحیح ہے، لیکن مجھ سے پوچھا جائے، تو میں فردوسی کو ایران کی تاریخ کا زیادہ حق دار سمجھتا ہوں۔

۵:- ابن مسکویہ کی کتاب میں بڑا نقص یہ ہے کہ آنحضرت صلعم اور خلفائے راشدین کے حالات نہایت ناتمام اور جستہ جستہ لکھے ہیں اور اس کی معذرت یہ کی ہے کہ میری کتاب کا مقصد ایسے حالات کا بیان کرنا ہے، جو ظاہری اسباب سے تعلق رکھتے ہوں، اور جن سے قواعد کلیہ قائم ہو سکیں، لیکن خلفاء کے فتوحات محض تائید الٰہی ہیں ان کو سلسلۂ علت ومعلول سے تعلق نہیں، ابن مسکویہ کے خاص الفاظ یہ ہیں،

ولم اجد فی تلک الحروب والوقعات مع عظمها وشدتها موضع حیلة ولا موقع تدبیر یستفاد منه تجربة الا الیسیر مما سنذکره وبقیة کله جهاد من القوم ونصر من الله واجتهاد من المسلمین وکان شرطنا فی اول الکتاب ان نثبت من الاخبار الا ما فیه تدبیر نافع فی المستقبل الخ

میں نے ان لڑائیوں میں باوجود اس کے کہ وہ عظیم الشان اور سخت لڑائیاں ہیں کوئی حیلہ اور تدبیر کی بات نہیں پائی، جس سے کوئی تجربہ پیدا ہو، بجز چند مختصر واقعات کے جن کو میں آگے ذکر کروں گا، ورنہ یہ تمام لڑائیاں، لڑائیاں نہیں، بلکہ قوم کا جہاد اور خدا کی تائید ہیں، اور ہم ابتدائے کتاب میں شرط کر چکے ہیں کہ صرف وہ واقعات لکھیں گے، جن سے آئندہ واقعات میں کوئی تجربہ حاصل ہو،

لیکن یہ کس قدر غلط خیال ہے، بے شبہہ عہد نبوت اور خلافت کے واقعات تائید الٰہی ہیں، لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ سلسلۂ اسباب سے الگ ہیں، جو یکجائی، جو خلوص، جو جوش، جو راست کرداری، جو عدل وانصاف، جو حق پرستی، ان معرکوں میں صرف کی گئی، جب کبھی صرف کی جائے گی، یقیناً یہی نتیجے ظاہر ہوں گے، اگر ان لڑائیوں میں اسباب وعلل کو دخل نہ ہوتا، تو جنگ احد میں شکست کیوں ہوتی؟ حنین میں اکثر لوگوں کے پاؤں کیوں اکھڑ جاتے۔ واقعہ جسر میں ہزاروں مسلمان کیوں شہید ہوتے؟ واقعہ یرموک میں مسلمانوں کو مفتوحہ مقامات سے ہٹ آنا کیوں پڑتا،

خدا نے فرمایا اور سچ فرمایا، انا کل شیء خلقناه بقدر۔ دہم جون سنہ ۱۹۰۹ء (از کلکتہ)

(الندوہ ج ۶، نمبر ۵، جمادی الاول سنہ ۱۳۲۷ھ)

لغت فرس از اسدی طوسی

ہم یورپ کی علمی فیاضیوں کا شکریہ ادا کرتے کرتے تھک جاتے ہیں، لیکن یورپ اپنی فیاضیوں سے نہیں تھکتا، عربی قدیم نادر تصنیفات کے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کرنے اور ان کے شائع کرنے کا ذکر الندوہ میں بار بار آ چکا ہے، اب موقعہ ہے، کہ فارسی سرمایہ کے مہیا کرنے کے متعلق جو کچھ یورپ کر رہا ہے کبھی کبھی اس کے حالات بھی اس علمی پرچہ کے ذریعہ سے شائع کئے جائیں،

اسدی کی نسبت عام تذکروں میں مذکور ہے کہ فردوسی کا استاد تھا، اگرچہ یہ محض غلط ہے، لیکن بہرحال وہ اسی زمانہ کا نہایت مشہور شاعر ہے، اور مثنوی میں نظامی کی طرز کی بنیاد اسی نے قائم کی، اسدی کو تمام دنیا صرف شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے، کہ وہ صرف شاعر نہیں، بلکہ فارسی لغت کا سب سے پہلا مدوّن ہے، اس نے اپنی کتاب کا نام لغت فرس رکھا ہے، اور صرف نادر اور غریب الفاظ جمع کئے ہیں،

یورپ کے ایک مشہور مستشرق پاول ہارن نے آٹھ برس کتاب کی تصحیح وتحشیہ میں صرف کئے اور، ۱۸۹۷ء میں اس کو شائع کیا اس کے پاس جو قلمی نسخہ تھا وہ محرم سنہ ۷۳۳ھ کا لکھا ہوا تھا، تصحیح وتحشیہ کے علاوہ اس نے ایک مطوّل دیباچہ بھی لکھا ہے لیکن چونکہ وہ جرمن زبان میں ہے، اس لئے ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکے، ایڈیٹر موصوف نے یہ کتاب پروفیسر نولدکی کے نام معنون کی جو یورپ میں آج تمام مستشرقین کا استاد الکل تسلیم کیا جاتا ہے، چونکہ اڈیٹر کو پروفیسر موصوف کی شاگردی کی عزت حاصل ہے چند فارسی اشعار لکھ کر شامل کئے ہیں، جس میں اس انتساب کو ظاہر کیا ہے وہ اشعار یہ ہیں،

چنین بود آئین ایرانیاں چو پیش آمدندے بہ گاہ کیاں
تو در دولت علم حاری دہیم[1] شہنشاہ عالی وما بندہ ایم
ولیکن بجز کے تو ہم مردمی کہ ہر مہتری ما بجوید ہمی
بدیں ہشت سال اندریں ہشر تو طلب کردہ ام علم با جستجو،
کنوں ایں کتاب تشکر شعار ترا باشد از من یکے یادگار

اب ہم اصل کتاب پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں،

۱:- مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "میں اس میں بلخ، ماوراء النہر اور خراسان وغیرہ کے لغات لکھتا ہوں" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اپنی ملکوں

---

[1] شاید دہیم کی تخفیف ہے،

کے لوگ شاعر اور ناثر تھے اور انہی کا کلام مستند سمجھا جاتا تھا، اس سے یہ عقدہ بھی حل ہوتا ہے کہ قدماء کی زبان جو بالکل نامانوس معلوم ہوتی ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے، کہ افغانستان اور ترکستان کے بہت سے الفاظ ان کے کلام میں آئے تھے جو اس وقت بالکل متروک ہو گئے بسبب شاعری منتقل ہو کر فارس کے صدر مقام میں آ گئی،

(۲) مصنف نے التزام کیا ہے کہ ہر لغت میں شعر کی سند لائے، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ چونکہ مصنف خود قدیم زمانہ کا شاعر ہے، اس لئے ایسے بہت سے قدماء کا کلام اس ذریعہ سے محفوظ رہ گیا جو آج بالکل معدوم ہیں، مثلاً بیہقی، ابو طاہر خسروانی، منجیک، لیان، کسائی، آغاجی، شاکر بخاری، قریع الدہر، بو شکور بلخی، ابو الفتح لبتی، معروفی، بو المثل، عمارہ مروزی، مرضعی، انشاس مشہور ہے کہ مثنوی سب سے پہلے رودکی نے لکھی، یعنی کلیلہ دمنہ کو مثنوی کی بحر میں نظم کیا، فردوسی نے شاہ نامہ میں اس مثنوی کا ذکر کیا ہے، لیکن آج یہ مثنوی بالکل نایاب ہے کہ اس کے دو چار شعر بھی ہاتھ نہیں آتے، اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی مولینا روم کے وزن پر ہے اس کے چند اشعار یہ ہیں،

دمنہ را گفتا کہ تا ایں بانگ چیست   با نہیب و سہم ایں آواے کیست
دمنہ گفت او را جزیں آوا دگر   کار تو نہ ؟ ہست و سہمے بیشتر
آب ہر چہ بیشتر نیرو کند   بند رود ع سست بودہ بفگند
دل گسستہ داری از بانگِ بلند   رنجگے باشدت و آوازِ گزند!

اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ رودکی نے شاہ نامہ کی بحر میں بھی ایک مثنوی لکھی تھی، اس کا ایک شعر یہ ہے،

نگو گفت مزدور با آن خدیش   مکن بد بہ کس گر نخواہی بخویش

عنصری کے تذکرہ میں اس کی مثنوی کا بھی ذکر کرتے ہیں مگر لکھتے ہیں کہ اب ناپید ہیں، اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ عنصری نے مختلف بحروں میں مثنویاں لکھی تھیں، شاہ نامہ کی بحر میں یہ اشعار ہیں،

(جبار یرا) چو سرگشتہ غنچہ سرخ گل   جہان جامہ پوشید ہر رنگ مل
(در بیما) اگر بر سر مرد زد در نبرد !   سر قاعتش باز میں پست کرد

ہفت پیکر کی بحر میں جو مثنوی ہے، زیادہ صاف اور شستہ ہے نمونہ یہ ہے،

گفت کیں مردمانِ بے باک اند   ہمہ ہموارہ دزد و چالاک اند

۳ ۔ عام طور پر مشہور ہے، کہ فردوسی نے یہ التزام کیا تھا کہ عربی الفاظ نہ آئیں، لیکن اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک عربی الفاظ، فارسی مثنوی میں یوں بھی کم برتے جاتے تھے، عنصری رودکی، بو شکور بلخی کی مثنویوں کے اشعار کثرت سے نقل کئے ہیں، ان میں بھی عربی الفاظ بہت ہی خال خال ہیں،

۴ ۔ ہمارا خیال تھا کہ ہزالی اور فحش گوئی، اس زمانہ تک مطلق پیدا نہیں ہوئی تھی، فردوسی نے ہجو لکھی تو اس قدر مہذب اور شائستہ لکھی کہ مستورات کو اس کے پڑھنے میں تامل نہیں ہو سکتا، لیکن اس کتاب سے معلوم ہوا، کہ یہ بلا اسی زمانہ میں پیدا ہو چکی تھی، لبیبی جو اس زمانہ کا ممتاز شاعر ہے، جعفر زٹل سے ذرہ بھر کم نہیں، بو شکور، اور منجیک بھی اکثر فحش کہتے ہیں، فردوسی اور فرخی وغیرہ اس زمانہ کے عام شاعر نہیں بلکہ مہذب شاعر ہیں، اگرچہ یہ یقینی ہے کہ یہ کتاب اسدی طوسی کی تصنیف ہے، مصنف نے خود ایک لغت کی سند میں اپنا نام لکھا ہے اور اس کے ساتھ مصنف کا لفظ اضافہ کیا ہے، لیکن یہ سخت تعجب ہے کہ کتاب میں جا بجا معزی کے اشعار ہیں، حالانکہ معزی سنجر کے زمانہ کا شاعر ہے، ہمارا خیال ہے، کہ یہ الحاقی اشعار ہیں، یعنی کسی نے بطور حاشیہ کے لکھے تھے، جو کتاب میں شامل ہو گئے،

اڈیٹر نے دیباچہ میں کسی کتاب کی عبارت نقل کی ہے جس کے یہ الفاظ ہیں:-

تصنیف حکیم اسدی خواہر زادہ حکیم ابو القاسم منصور فردوسی رحمۃ اللہ علیہ،

اگر یہ نقل صحیح ہو تو اسدی کی فہرست مفاخر میں یہ اضافہ ہو جاتا ہے کہ وہ فردوسی کا بھانجا تھا،

یہ بھی کچھ کم تعجب کی بات نہیں، کہ ایک ہی شہر اور ایک ہی خاندان میں دو شاعر اس رتبہ کے پیدا ہوں، کہ اقلیم سخن انہیں دونوں میں تقسیم ہو کر رہ جائے،

دوبارہ ہم پاول ہارن صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی بدولت ایک ایسی نایاب اور گم شدہ کتاب بہم پہنچی، اور شائع ہوئی،

نام نیک رفتگان ضائع مکن
تا بماند نام نیکت یادگار!

(الندوہ ج ۸ نمبر ۳ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ)

الملل والنحل اور ابن حزم ظاہری

اسلام میں ایک مدت تک معقول و منقول، دونوں الگ الگ رہے، امام غزالی نے دونوں کا تعارف کرایا، اور رفتہ رفتہ اتحاد اس قدر بڑھا کہ آج دونوں کو الگ کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، لیکن محدثین کا گروہ اخیر تک اپنے انداز پر قائم رہا، چنانچہ اس مقدس فرقے میں کوئی ایسا شخص نہیں پیدا ہوا، جو منطق یا معقول کے لقب سے ممتاز ہو، صرف دو شخص اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں، ابن تیمیہ اور ابن حزم، ان دونوں بزرگوں کے معتقدات اور خیالات، اس امر کے اندازہ کرنے کے لئے نہایت نتیجہ خیز ہیں، کہ حدیث کو فلسفہ سے کس حد تک ربط ہو سکتا ہے! یہ دونوں بزرگ، بہت بڑے محدث اور ٹھیٹ مذہبی آدمی تھے، انہوں نے گو فلسفہ میں کمال پیدا کیا تھا، لیکن فلسفہ میں کمال کو بالکل حقیر سمجھتے تھے، اور اسی لئے فلسفہ کا ان پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا تھا، چنانچہ ابن تیمیہ نے فلسفہ کے رد میں ایک ضخیم کتاب چار جلدوں میں لکھی، ابن حزم نے بھی متعدد کتابوں میں فلسفہ کے مسائل رد کئے ہیں،

اہل سنت و جماعت میں عقائد کے اعتبار سے تین شاخیں ہیں، اشاعرہ، ماتریدیہ، محدثین، لیکن ایک مدت سے تمام اسلامی دنیا میں صرف اشاعرہ کی کتابیں متداول اور زیر درس ہیں، ماتریدیہ کے اقوال کہیں کہیں انہیں کتابوں میں آ جاتے ہیں، لیکن محدثین کی تصنیفات سرے سے ناپید ہیں، اور ان کے اقوال بھی (بجز صفات باری کے) کسی مسئلہ کے متعلق نہیں پائے جاتے حالانکہ اصول عقائد کے متعلق، سب سے زیادہ انہیں کی رائیں معتبر ہو سکتی ہیں، اب خوش قسمتی ہے اس مقدس گروہ کی تصنیفات کی طرف توجہ مبذول ہوئی ہے، چنانچہ ابن تیمیہ کی کتاب العقل والنقل و منہاج السنہ اور ابن حزم کی کتاب الملل والنحل حال میں چھپ کر شائع ہوئی ہے، ہم اس وقت اسی کتاب (الملل والنحل) پر تقریظ لکھنی چاہتے ہیں، لیکن اصل بحث سے پہلے ہم نہایت اختصار کے ساتھ ابن حزم کے حالات لکھتے ہیں، ان کا نام علی ابن احمد ابن سعید بن حزم ہے، خاندان بنو امیہ سے تھے، قرطبہ میں ۳۸۴ھ

میں پیدا ہوئے اور ۴۵۶ھ میں وفات پائی، ۴۰۸ھ میں حدیث کی تحصیل شروع کی، علوم دینیہ کے ساتھ، منطق و فلسفہ میں بھی کمال پیدا کیا، پہلے شافعی تھے، پھر ظاہری ہو گئے، یعنی ظواہر قرآن و حدیث کے سوا قیاس کو نہیں مانتے تھے، بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے محلی بڑے پایہ کی کتاب ہے ان کی تصنیفات ۸۰ ہزار ورق میں ہیں، امام غزالی نے لکھا ہے کہ میں نے ان کی ایک تصنیف دیکھی ہے جس سے ان کا کمالِ حفظ و ذہانت ثابت ہوتا ہے،

ابن صاعد اندلسی لکھتے ہیں، کہ ابن حزم کو علوم اسلامیہ میں جو کمال تھا، تمام اندلس میں کسی کو نہ تھا، حمیدی کا بیان ہے کہ ہم نے ان کا نظیر نہیں دیکھا، یہ تمام واقعات علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھے ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ ابن حزم، علمائے کبار میں ہیں اور اجتہاد کے تمام شرائط ان میں پائے جاتے ہیں،

کتاب الفصل والنحل اس کتاب میں مصنف نے فلاسفہ، ملاحدہ، مادیین، یہود، نصاریٰ غرض اکثر اہل مذاہب کے عقائد و خیالات نقل کئے ہیں، اور ان کا رد لکھا ہے، اغیار مذاہب کے رد میں علمائے اسلام کی بہت سی تصنیفات ہیں لیکن اس کتاب میں یہ خصوصیت ہے کہ دوسروں کے عقائد و خیالات کو نہایت تحقیق سے لکھا ہے، توراۃ اور انجیل کے محرف ہونے پر جو بحث کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف کو یہود و نصاریٰ کی کتابوں پر مجتہدانہ عبور تھا، غیر مذاہب کے ابطال کے بعد مصنف نے خود اسلامی عقائد سے بحث کی ہے، اور ہر فرقہ کے ان مسائل کا رد کیا ہے، جو اس کے نزدیک غلط اور باطل ہیں ہم کو صرف اسی حصہ سے بحث ہے، سب سے پہلے، انبیاء کے مسئلہ کو لکھا ہے، اور نہایت تفصیل سے لکھا ہے، عقائد کی موجودہ کتابوں میں اگرچہ عموماً یہ مسئلہ مسلم قرار پا گیا ہے، کہ انبیاء معصوم ہیں، لیکن اکثر تفسیر کی کتابوں میں جو روائتیں مذکور ہیں اور وہ تمام مسلمانوں میں پھیل گئی ہیں، وہ بالکل اس کے خلاف ہیں، ابن حزم نے نہایت آزادی اور دلیری سے ان تمام روایتوں کی لغویت ثابت کی ہے، حضرت داؤد کی نسبت مشہور ہے کہ انہوں نے ایک دن اتفاق سے اوریا کی بیوی کو نہاتے دیکھ لیا، چونکہ وہ نہایت حسین تھی، اس لئے اس سے شادی کا ارادہ کیا اور اسی غرض سے اس کے شوہر کو لڑائی پر بھیجدیا جب وہ لڑائی میں مارا گیا، تو اس کی بیوی سے شادی کرلی، قرآن مجید میں ایک موقع پر یہ واقعہ مذکور ہے، کہ دو بھائی حضرت داؤدؑ کے پاس لڑتے ہوئے آئے کہ ہمارا مقدمہ فیصل کر دیجئے، جھگڑا یہ تھا کہ ایک بھائی کے پاس ۹۹ دنبے تھے اور دوسرے کے پاس صرف ایک، وہ اس سے کہتا تھا کہ اپنا دنبہ بھی مجھ کو دے ڈال، حضرت داؤد نے یہ سن کر کہا کہ یہ ظلم ہے، پھر ان کو خیال ہوا، کہ خدا نے میرا امتحان لیا، اکثر مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ وہی حضرت داؤد کا قصہ ہے، وہ دونوں آدمی نہ تھے، بلکہ فرشتے تھے، اور انہوں نے اس پیرایہ میں حضرت داؤد کو متنبہ کیا کہ تمہارے ۹۹ بیبیاں ہیں، اور اوریا کی صرف ایک، وہ بھی تم نے چھین لی،

ابن حزم لکھتے ہیں کہ وہ فرشتے نہ تھے، بلکہ واقعی دو آدمیوں میں نزاع تھی، اور وہ درحقیقت انفصالِ مقدمہ کے لئے آئے تھے ان کے الفاظ یہ ہیں،

وھذا قول صادق صحیح لا یدل علی شئی مما قاله المستهزؤن الکاذبون المتعلقون بخرافات ولدها الیهود وانما کان ذلک الخصم قوما من بنی آدم بلا شک مختصمین فی نعاج من الغنم علی الحقیقة ومن قال انهم کانوا ملئکة معرضین بامر النساء فقد کذب علی الله عزوجل وقوله ما لم یقل وزاد فی القرآن ما لیس فیه وکذب الله عز وجل

قرآن مجید کا بیان بالکل صحیح اور سچ ہے وہ دروغ گو مسخرے جو یہودیوں کے خرافات کی سند کرتے ہیں ان کے اقوال کیطرف اس آیت میں کچھ بھی اشارہ نہیں پایا جاتا، وہ دونوں شخص واقعی آدمی تھے اور ان میں درحقیقت دنبوں کے متعلق جھگڑا تھا، جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ فرشتے تھے اور انھوں نے عورتوں کے قصہ کی طرف اشارہ کیا تھا، تو وہ خدا کو جھوٹ لگاتا ہے اور وہ بات کہتا ہے جو خدا نے نہیں کہی اور قرآن پر حاشیہ چڑھاتا ہے اور خدا کو جھٹلاتا ہے،

اس کے بعد ابن حزم لکھتے ہیں، کہ اس قسم کی باتیں بدمعاش اور پاجیوں کیطرف منسوب کیجاسکتی ہیں نہ کہ (نعوذ باللہ) انبیائے کرام کی طرف" اسی طرح یہ واقعہ عام طور پر مشہور، اور کتب تفسیر میں منقول ہے کہ حضرت سلیمان گھوڑوں کا جائزہ لے رہے تھے، اس میں اس قدر مشغول ہوئے کہ عصر کی نماز جاتی رہی، جب ان کو خیال آیا تو گھوڑوں کی پنڈلیاں کٹوا ڈالیں اور جب ان کی دعا سے آفتاب دوبارہ طلوع ہوا، تو نماز عصر ادا کی، ابن حزم اس روایت کی نسبت لکھتے ہیں۔

وھذہ خرافة موضوعة مکذوبة سخیفة باردة والظاهر انها من اختراع زندیق بلا شک،

یہ خرافات، جھوٹ، بیہودہ، اور لغو روایت ہے، بظاہر یہ روایت کسی زندیق نے ایجاد کی ہے،

ایک نہایت مہتم بالشان مسئلہ جس پر ابن حزم نے نہایت تفصیل سے بحث کی ہے سحر اور جادو کی حقیقت ہے، یہ بحث اگرچہ درحقیقت، سائنس سے تعلق رکھتی ہے، لیکن چونکہ سحر کا لفظ مذہبی کتابوں میں آگیا ہے، اس لئے یہ ایک مذہبی مسئلہ بن گیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں کہ سحر اور جادو کوئی چیز ہے، لیکن بحث یہ ہے کہ سحر میں درحقیقت انقلاب ماہیت ہوتا ہے، یا صرف شعبدہ بازی، اور نیرنگ سازی کو سحر کہتے ہیں، اکثر اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ سحر کے ذریعہ سے تمام خرق عادات وجود میں آسکتے ہیں اور افسوس ہے کہ عام طور پر یہی عقیدہ تمام مسلمانوں میں پھیلا ہوا ہے ابن حزم نے نہایت زور و شور سے سحر کا انکار کیا ہے اور حسب ذیل دلیلیں پیش کی ہیں۔

(۱) خدا نے کائنات کی جو ترتیب قرار دی ہے، وہ بدل نہیں سکتی، جیسا کہ خود قرآن مجید میں ہے کہ لا مبدل لکلماته چنانچہ علامہ موصوف نے قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے استدلال کر کے لکھا ہے۔

فصح ان کل ما فی العالم مما قد رتبه الله عز وجل الترتیب الذی لا یتبدل

تو ثابت ہوا، کہ جو کچھ عالم میں خدا نے ترتیب دیا ہے، وہ بدل نہیں سکتا،

(۲) اگر سحر صحیح ہو تو معجزہ اور سحر میں کیا فرق ہوگا۔

ویقال لمن قال السحر یحیل الاعیان ویقلب الطبائع اخبرونا اذا جاز هذا فای فرق بین النبی والساحر ولعل جمیع الانبیاء کانوا سحرة کما قال فرعون عن موسی علیه السلام انه لکبیرکم الذی علمکم السحر

جو شخص یہ کہتا ہے کہ جادو قلب ماہیت کر دیتا ہے اس سے کہنا چاہیئے کہ اگر یہ صحیح ہے تو پیغمبر اور جادوگر میں کیا فرق باقی رہے گا، اس صورت میں یہ احتمال پیدا ہوگا کہ تمام انبیاء جادوگر ہی تھے، جیسا کہ فرعون نے حضرت موسیٰ کے نسبت کہا تھا کہ بڑا جادوگر ہے، اور اسی نے تم کو جادو سکھایا ہے،

سحر کے ثبوت میں، اکثر لوگ فرعون کے جادوگروں کا واقعہ پیش کرتے ہیں، جو قرآن مجید

میں مذکور ہے، علامہ موصوف نے قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے ثابت کیا ہے کہ وہ صرف شعبدہ بازی تھی، وہ آیتیں یہ ہیں:-

یُخَیَّلُ اِلَیْہِ مِنْ سِحْرِھِمْ اَنَّھَا تَسْعٰی   حضرت موسیٰ کو ان کے جادو کی وجہ سے خیال ہوتا تھا کہ ان کی رسیاں اور لاٹھیاں
اِنَّمَا صَنَعُوْا کَیْدُ سَاحِرٍ   دوڑ رہی ہیں، ان لوگوں نے جادوگر کا کرتب کیا ہے،

پہلی آیت سے ثابت ہوا کہ وہ صرف تخیل تھا، کوئی واقعی چیز نہ تھی، دوسری آیت میں کید کا لفظ ہے جس کے معنی فریب کے ہیں،

قرآن مجید میں ہاروت و ماروت کے متعلق مذکور ہے، کہ لوگ ان سے جادو سیکھتے ہیں، اور اس کے ذریعہ سے میاں بیوی میں جدائی کرا دیتے ہیں اس آیت سے بھی سحر کی واقعیت پر استدلال کیا جاتا ہے، علامہ موصوف اس کے جواب میں لکھتے ہیں،

فہذا امر ممکن یفعلہ نمام   یہ ممکن بات ہے، جس کو چغل خور بھی کر سکتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم پر لبید ابن عاصم نے جادو کر دیا تھا جس کی وجہ سے آپ کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ جو کام آپ نے نہیں کیا ہوتا تھا، اس کی نسبت آپ کو خیال ہوتا تھا کہ کر لیا ہے اس حدیث کے جواب میں علامہ موصوف لکھتے ہیں۔

فلیس فی ھذا احالۃ الطبیعۃ   اس میں بھی طبیعت کا بدلنا یا قلب ماہیت
ولا قلب عین وانما ھو تاثیر لقوۃ   نہیں ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ جب آدمی کو
تلک الصناعۃ ونحو... یجد الانسان   کوئی شخص گالی دیتا ہے، یا کوئی ایسی
یسب او یقابل بحرکۃ یغضب منہا   بات کرتا ہے، جس سے اس کو غصہ آجائے
فیستحیل من الحلم الی الطیش   تو اس کا حلم غصہ سے اور سکون حرکت سے
وعن السکون الی الحرکۃ   بدل جاتا ہے،

فلسفۂ حال کے مسائل میں سب سے زیادہ جو مسئلہ مسلم الثبوت مانا جاتا ہے، قانونِ قدرت کا مسئلہ ہے، اور کچھ شبہہ نہیں کہ اس سے زیادہ کوئی چیز قطعی اور یقینی نہیں لیکن عام خیال یہ پھیلا ہوا ہے کہ یہ مسئلہ زمانۂ حال کی تحقیقات میں سے ہے، یا کم از کم یہ کہ پہلے اس مسئلہ کی طرف خیال رجوع نہیں ہوا تھا، اور اسی لئے قدیم لٹریچر میں یہ اصطلاح موجود نہیں، لیکن یہ خیال تمام تر غلط ہے، فلاسفۂ اسلام تو عموماً اس کے قائل تھے، فقہا اور محدثین میں بھی اشاعرہ کے سوا اس کا کوئی منکر نہیں چنانچہ ابن تیمیہ نے اپنی تصنیفات میں نہایت تصریح سے اس کو لکھا ہے،

علامہ ابن حزم نے اس بحث پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں الکلام فی الطبائع[1] اس بحث میں پہلے اشاعرہ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ طبائع کے قائل نہیں، پھر نہایت تفصیل سے اس کا رد لکھا ہے، ان کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ عرب میں متعدد الفاظ تھے جو اس معنی میں استعمال کئے جاتے تھے، مثلاً طبیعۃ، خلیقۃ، غریزہ، سجیہ، جبلت، حمید بن ثور کا شعر ہے،

لکل امرء یا ام عمرو طبیعۃ   وتفریق ما بین الرجال الطبائع
اے ام عمرو ہر شخص کی ایک خاص فطرت ہوتی ہے   اور آدمیوں میں جو فرق ہے وہ فطرتوں ہی کا ہے،

یہ الفاظ آنحضرت صلعم و صحابہ کے سامنے استعمال کئے گئے اور کسی نے ان سے انکار نہیں کیا۔

بلکہ آنحضرت صلعم نے یہ الفاظ استعمال فرمائے صحابہ میں سے ایک بزرگ نے آنحضرت صلعم سے پوچھا کہ مجھ میں جو حلم اور بردباری پائی جاتی ہے وہ میری جبلت ہے یا تربیت اور کسب سے حاصل ہوئی ہے، آپ نے فرمایا، نہیں بلکہ خدا نے تم کو اس پر مجبول کیا ہے، اس استدلال کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں۔

الطبیعۃ علیٰ انہا لا تستحیل ابداً   اور یہ تمام طبائع اور عادات خدا نے پیدا کئے
وکل ھذہ الطبائع والعادات
مخلوقۃ خلقہا اللہ عز وجل فرتب
ولا یمکن تبدیلہا عند کل ذی عقل   ہیں اور طبائع کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ کسی
کطبیعۃ الانسان بان یکون ممکنا   طرح بدل نہیں سکتی، اور اس کا بدلنا کسی عاقل
لہ التصرف فی العلوم والصناعات   کے نزدیک ممکن نہیں مثلاً انسان کی فطرت
ان لم یعترضہ آفۃ وطبیعۃ الحمیر   ایسی بنائی ہے کہ اگر کوئی آفت نہ آئے
والبغال بانہ غیر ممکن منہا ذالک   تو وہ علوم اور ہنر سیکھ سکتا ہے اور گدھے
وکطبیعۃ البر ان لا ینبت شعیراً   اور خچر کی فطرت ایسی بنائی کہ ان سے
ولا جوزاً وھکذا کل ما فی العالم   یہ امور ممکن نہیں، اسی طرح گیہوں
مقرون بالصفات وھی الطبیعۃ   سے جو یا اخروٹ نہیں پیدا ہو سکتا غرض
لنفسہا   دنیا میں جتنی چیزیں ہیں، ان میں خاصیتیں
پائی جاتی ہیں کہ وہی ان کی فطرت ہے۔

اس کتاب میں بعض خیالات بالکل جدید ہیں، مثلاً یہ بحث کہ عورتیں پیغمبر ہو سکتی ہیں یا نہیں اس کے متعلق ہم کو جہاں تک معلوم ہے، آج تک کسی نے اثبات کا پہلو نہیں لیا لیکن علامہ ابن حزم کا دعویٰ ہے کہ عورتیں پیغمبر ہو سکتی ہیں چنانچہ اس بحث کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے اور قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے اس پر استدلال کیا ہے،

عام خیال یہ ہے کہ عورتوں کا درجہ مردوں سے کم ہے لیکن علامہ ابن حزم اس کے خلاف ہیں، صحابہ کی فضیلت پر جہاں بحث کی ہے وہاں اس مسئلہ کو تفصیل سے لکھا ہے، اور قرآن مجید کی جن آیتوں سے مردوں کی فضیلت ثابت ہوتی ہے ان کا جواب دیا ہے (دیکھو جزو چہارم ص۱۷۸) علامہ موصوف کا یہ خیال صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ ہمارے زمانہ کے تعلیم یافتہ حضرات کے ہم خیال پہلے بھی موجود تھے،

(الندوہ ج ۲ نمبر ۵، شعبان ۱۳۲۳ھ)

اُردو نثر کی داستان

اُردو ادب کا ایک مستند سلسلہ

قدم بہ قدم منزل بہ منزل اُردو نثر نگاروں کے حالاتِ زندگی!

اِس وقت تک پندرہ اقساط شائع ہو چکی ہیں۔

مطبوعات شیخ غلام علی

ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

---

[1] ملل ونحل جزو خامس ص۱۵ مطبوعہ مصر